اردو ادبیات کا نقیب اور تخلیق و تنقید کا اشاریہ
ماہنامہ
سخن دان
اسلام آباد
جنوری 2022ء

اردو ادبیات کا نقیب اور تخلیق و تنقید کا اشاریہ

جنوری 2022ء ☆☆☆☆☆☆☆ شمارہ نمبر 09، جلد 01

# ماہنامہ سخن دان اسلام آباد

# مشمولات

مدیر

# ناقوس

## جدید غزل کا بیانیہ؛ منظر اور پیش منظر

انسان کی جبلت میں نطق ایک قوائے حیوانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ حواسِ نفسانی کا ہر پہلو چاہے وہ ظاہری امور سے متعلق ہو یا باطنی امور سے، ان سب کا ایک خاص تعلق حاسۂ نطق سے بھی ہے۔ نطق اظہارِ امر کے بغیر اپنی وجودی حیثیت سے معنون نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ انسان کی اصلِ طبیعت کے امورِ عشرہ (پانچ حواسِ ظاہری، پانچ حواسِ باطنی) کو کسی نہ کسی صورت اظہار یا اشیا کو قبولنے یا رد کرنے کے عمل سے جانا جائے۔ یہ انسانی زندگی کا اہم ترین مقصد بھی ہے اور ضرورت بھی۔ اس سے پہلو تہی کر کے انسان کا زندہ ہونا بے معنیٰ ہے۔ زندگی خود ایک جمالیاتی قدر ہے لیکن زندگی کا کمال انسان کے فطری حوائج کی تکمیل میں جمالیاتی اقدار سے حسبِ حال اکتساب میں مضمر ہے۔ غزل بھی ایک جمالیاتی معیار ہے جس کی بنیادیں تہذیبی اور پیش منظر آفاقی ہو چکا ہے۔

غزل فن ہی نہیں، تہذیب بھی ہے اور تہذیبی حقائق کی نقیب بھی۔ بلاشبہ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ادبی سماج میں غزل نے جتنے آسمانوں پہ کمندیں ڈالی ہیں، اتنی ہی زمینوں کے دفینے بھی کھوج نکالے ہیں۔ زندگی کی علامتی معنویت کو سب سے پہلے غزل ہی نے محسوس کیا اور ہر گوشۂ حیات کی نقابت کا پیمان باندھا ہے۔ غزل اپنی ان کائناتی اوصاف کے باوجود کوئی خاص اور عہد بند بیانیہ محفوظ نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ غزل اب تک بھلی چنگی سانس لے رہی ہے۔

روایتی غزل کا بیانیہ انسان کے جذبہ ہائے شعور کی کفالت میں بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن جدید غزل میں محض Transcendental حوالہ غزل کی آبرومندی کے لیے ناکافی ہے۔ معروف فلسفی جرگن ہیبرماس نے اپنی کتاب ''The Theory of Communicative action'' میں واضح طور پر لکھا ہے کہ ''کسی بھی تصور کی آفاقیت کا دفاع ممکن نہیں کیونکہ ڈسکورس بدلتا رہتا ہے۔'' غزل ظاہر ہے تہذیبی ڈسکورس ہے۔ اس کا بیانیہ ہر تخلیقی عہد کی بدولت نئے چہرے پہنتا رہتا ہے۔ جدید غزل کا بیانیہ رسمی روشوں سے جزوی تعلق بھی پیدا کیے بغیر ایک آزاد اور عمومی تناظر میں پیدا ہوا ہے۔ اشیا کی Transcendental سرگرمیوں کی بجائے ان کے وجودی احوال اور نفسی تقاضوں کو سمجھنے کی مربوط سعی کا آغاز بھی جدید غزل ہی کا منشا و منشور ہے۔

جدید غزل کے پیش منظر میں اہم ترین مرحلہ وہ ہے جہاں اس کا بیانیہ انسان کے انسان ہونے سے

بحث نہیں کرتا، اسے ذہن کی تمام Faculties میں رکھ کر قبول کر لیتا ہے۔ شاعرانہ تصورات کی تمام شقیں، چاہے وہ متکلم سے متعلق ہوں یا مخاطب سے، تصوراتی تصویروں میں سچائی کی رنگ آفرینی کا عمل جدید غزل ہی کی دَین ہے۔ 60ء کے بعد جدید غزل نے صحیح معنوں میں تصورِ تہذیب، تصورِ انسان اور تصورِ حیات کو Materialize کیا ہے۔ جدید غزل نے اوائل میں تجریدیت پہ تمام انحصار رکھا پھر وجودی طرزِ احساس کی آمیزش سے ایک نئی فکری زمین ہموار کی اور جمالیاتی اقدار کا ایک تازہ سانچا تیار کیا جسے اشتراکیت، جمہوریت اور نفسیات کی مثبت قدروں اور اصولوں نے عصری آگہی اور تاریخی شعور کی پرچک دی۔ جدید غزل کا بیانیہ اس اصول پر بھی کاربند رہا کہ کسی بھی عہد کی جمالیاتی آگہی اس عہد کے معاشرتی اور تہذیبی نشیب و فراز کی تفہیم پر منحصر ہوتی ہے، اس لیے سچا اور جدید ادب معاشرے کے رویوں کا عکاس ہونا چاہیے۔ لیکن شاید یہ اصول نقادوں میں متنازع فیہ بھی اسی لیے رہا کہ جدیدیت کوئی باقاعدہ سماجی یا معاشرتی رویوں سے ترکیب پانے والا وجودی حال نہیں بلکہ ایک عصری حقیقت کے طور پر جنم لینے والا وقت اور انسان کے مابین ایک خاص نوع کا تعلق ہے جسے بہت سے نفسیاتی اور فطری معتقدات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی اور اسے جدیدیت کا نام دیا گیا۔ فی الواقع یہ جدیدیت اشیا کے وجودی ڈھانچے پہ زیادہ غور کرتی ہے اور ان کی ماورائی حقیقت پر کم التفات کرتی ہے۔ اس اعتبار سے جدیدیت کے بعض مضرات بھی ہیں، لیکن ان سے قطع نظر جدید ادب میں غزل کا بیانیہ بہت حد تک ایک المیہ سا بن گیا۔ سوال، کھوج، کاوش، ربط، وجود، نفس اور مطلق قوتیں.... یہ سب جدید غزل کے نئے اور متنوع موضوعی وسیلے ہیں۔

جدید غزل کا بیانیہ اپنے منظر میں عصری ہے۔ یعنی عصری تلازموں کی تلاوت، انسان کے کائناتی تعلقات کی جہتوں کی دریافت اور اسبابِ ربط کی کھوج، یہ سب جدید غزل کا مابہ الامتیاز اسلوب ہیں۔ پیش منظر میں جدید غزل میں انسانی زندگی کے اصولی فیصلوں کے اوصاف کا تذکرہ کریں تو تنفر، بیزاری، خود غرضی، اخلاقی و جمالیاتی اقدار کی پامالی، اصلِ حیات سے روگردانی، نفسی طبائع کا بے دریغ استحصال اور انسانی حقوق میں تشدد بطور ایک معاشرتی المیہ وغیرہ جدید غزل کے سچے بول ہیں۔ اجمالاً یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ جدید غزل کا بیانیہ اپنے منظر اور پیش منظر دونوں میں عصری پیمانوں پہ استوار ہے۔ شاعری بالخصوص غزل کی تنقید میں عموماً یہ غلط تاثر پنپ رہا ہے کہ عصری حقائق کی ترجمان شاعری متعلقہ عہد سے باہر نہیں نکل سکتی اور نہ زندگی کے تمام جذبوں کی ترجمان بن سکتی ہے۔ لیکن یہ ایک واہمہ ہے۔ عصری احوال محض تاریخ کی نوعیت میں شاعری کا حصہ نہیں بنتے بلکہ انسان سے متعلقہ تمام امور کا جذباتی اور تخلیقی اظہار ہوتے ہیں۔ اور انسان جب تک ہے، اس کے جبلی جذبے اور ان کے متعلقات کی تفہیم و تعبیر کے لیے عصری اور بعض دفعہ ہنگامی شاعری بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ جدید غزل ہنگامی بھی ہے اور عصری بھی، اس تناظر سے انسان کی نفسیاتی اور طبعی ساخت کی ترجمانی کا سب سے عمدہ اور جمالیاتی قالب جدید غزل ہی ہے۔

تجربۂ فنی و فکری جدید غزل کی بڑی اکائی ہے۔ بایں لحاظ سخن دان کا حاضر شمارہ نظم و نثر دونوں میں کسی بلند بانگ نعرے کا حامل نہ ہونے کے باوجود منظوم سیکشن میں اپنے انتخاب کی داد چاہے گا۔

---

خشت پشتِ دستِ عجز و قالب آغوشِ وداع
پُر ہوا ہے سیل سے پیمانہ کس تعمیر کا

مرزا اسداللہ خان غالبؔ

ڈاکٹر ابو شہیم خان

# ترجمہ: ایک تہذیبی و لسانی مفاہمہ

تمام علمی و ادبی کارناموں کی طرح ترجمے کا بھی راست تعلق ترسیل اور ابلاغ سے ہے۔ ترسیل اور ابلاغ کو موثر، بلیغ اور مفرح بنانا اور بنائے رکھنا ہمیشہ ایک چیلنج رہا ہے خاص طور پر تخلیق کاروں کے لیے۔ اس چیلنج سے نبرد آزمائی میں ترجمے کی ایک تاریخی اہمیت ہے کیوں کہ ترجمہ تجربے کی تشکیلِ نو اور ترسیل کے ساتھ تخیل کو بھی بال و پر عطا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ اسی لیے جملہ امور عالم میں جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت و قدر و قیمت رکھتی ہیں ان میں ترجمہ کو بھی شاملِ حال سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل فن ہے جس میں دسترس کے لیے شوق و صلابت، مشق و مزاولت درکار ہے۔ یہ فن مشرق و مغرب کی بعض یونیورسٹیوں میں ایک علاحدہ مضمون کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ دوسرے سماجی علوم کی طرح ''مطالعاتِ ترجمہ یا ترجمیات''، کا بھی سائنس یا آرٹ ہونا اور نہ ہونا زیر بحث ہے۔ اس کی روز افزوں ترقی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر مختلف عالموں نے ترجمہ کو مختلف ناموں سے موسوم کیا ہے۔ کسی نے اس کو نگینہ جڑنے کا فن تو کسی نے لسانی و تہذیبی مفاہمہ کا نام دیا ہے۔ اسی طرح کچھ نے بین الاقوامی انداز نظر پیدا کرنے کا وسیلہ اور تہذیبی معاملوں کے اتحاد کا نام دیا ہے، تو بعض نے ترجمہ کو تصورات کی تہذیبی باز آبادکاری (CulturalRehabilitiation) کا فریضہ ادا کرنے والا بھی کہا ہے۔ غرضیکہ مختلف دانشوروں نے اس کو مختلف اغراض و مقاصد کے پیش نظر یا پس منظر میں اس کی تعریف و توضیح کی ہے۔

عظیم مؤرخ DanielBorestin نے ترجمہ کی اہمیت یوں بیان کی تھی کہ :

"Translation is a great device of exploration."

پروفیسر محمد حسن نے ترجمے کے بارے میں لکھا تھا کہ :

> ''بنیادی طور پر ترجمہ لسانی و تہذیبی مفاہمہ ہے جو نہ اصل کی لذت کو پوری طرح پا سکتا ہے نہ اس سے مکمل طور پر محرومی کو قبول کرتا ہے۔''

ترجمہ ایک زبان کے مافی الضمیر کو دوسری زبان میں پیش کرنا ہے جس کے ذریعے تمدنی افہام و تفہیم کے مرحلے طے کیے جاتے ہیں اور تصنیف و تالیف کے تشکیلی منزلوں کی معلومات بہم پہنچائی جاتی ہے۔

دنیا کے مختلف حصوں کی تہذیبی، سیاسی، معاشی اور سماجی تاریخ و روایات کئی معنوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک دوسرے کو جاننے سمجھنے اور رابطہ قائم کرنے کا عمل مختلف ذریعوں، سطحوں اور سمتوں میں قدیم زمانے سے ہوتا رہا ہے۔ وقت اور ذرائع کی بنیاد پر یہ عمل کبھی تیز اور کبھی سست ہوتا ہے۔

انسانی ارتقا کی تاریخ میں زبان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جو افراد کے درمیان رابطہ قائم کرنے کا مؤثر ترین ذریعہ ہے جو اگلے وقتوں کے لیے علم کو محفوظ رکھنے کا کام بھی انجام دیتی ہے۔ دوسرے کی بات سمجھنے اور اپنی بات سمجھانے کے لیے کسی مشترک زبان کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے تراجم کا عمل انسانی تہذیب و تمدن، مزاج اور تاریخ کی دریافت و شناخت کا اہم ذریعہ بن جاتا ہے۔ ترجمہ زبان کو علمی اور ادبی سطحوں پر ایک وسیع تناظر بھی مہیا کرتا ہے جس کے ذریعہ زبانیں تجربہ اور اعتماد حاصل کرتی ہیں۔ جن تہذیبوں میں دوسری تہذیبوں سے رابطہ قائم کرنے کا یہ عمل رک جاتا ہے ان کی ترقی کی راہیں محدود یا مسدود ہو جاتی ہیں، ترجمہ کی مدد سے ہی انسانی تاریخ میں فلسفہ، حکمت و تہذیب کے ارتقا کی کھوئی ہوئی کڑیاں بھی مل جاتی ہیں۔ ترجمے کی اسی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ظ۔ انصاری لکھتے ہیں :

> ''سقراط اور افلاطون کی دو ہزار سال سے زیادہ پرانی کاوشیں، روما اور یونان کے قدیم کھنڈروں میں دب کر رہ گئی تھیں اگر عربی زبان کے ذی علم مترجم انھیں وہاں سے نکال کر یورپ اور ایشیا کی آخری سرحدوں تک کھلی ہوا میں نہ لے گئے ہوتے۔ بو علی سینا، ابنِ رشد، ابو نصر فارابی کے کارنامے، یروشلم، غرناطہ اور بغداد کے محاصرے میں دم توڑ چکے ہوتے اگر بعد کی لاطینی زبانوں نے انھیں اپنے یہاں منتقل کر کے تاریخ و فلسفے کے اگلے وقتوں کے لیے محفوظ نہ کر لیا ہوتا۔''

ادب مشرق کا ہو یا مغرب کا، یہ انسانیت کا ایک مشترک سرمایہ ہوتا ہے اور اس سرمایہ پر پورے عالمِ انسانی کا حق ہے۔ ترجمہ ہی وہ واحد وسیلہ ہے جس کے ذریعہ عالمِ انسانی اپنے اس حق کا استعمال کر سکتا ہے اور عالمگیر آگہی کے نور و سرور سے مستفیض ہو سکتی ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسن صاحب :

> ''عالم گیر آگہی کا نور اور سرور ایک زبان کے دامن میں تو سمٹنے سے رہا۔ جب تک ایک زبان کے بولنے والے دوسری زبانوں کے علم و آگہی، جذبے اور شعور، فکر و احساس، ٹیکنیک اور سائنس تک پہنچنا چاہیں گے، ترجمے کا سہارا لیں گے۔ خواہ یہ سہارا کیسا ہی ناتمام اور ناقص کیوں نہ ہو۔''

پچھلی کئی دہائیوں میں ذرائعِ ترسیل و ابلاغ کے فروغ یا برقیاتی انقلاب و مہاجرت نے مختلف تہذیبوں کے اختلاط کا عمل تیز تر کر دیا ہے۔ مسافرت، ٹیلی ویژن، فیکس، ٹیلی فون، انٹرنیٹ اور کنور جنس (Convergence) اور اس کے علاوہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دیگر وسائل کے ذریعہ مختلف تہذیبوں کے بیچ کی دوریوں میں کمی اور تہذیبی تصادم کے نظریہ کو ضرب پہنچی ہے۔ عالمی گاؤں یا گلوبل ویلج (GlobalVillage) کا تصور ایک حقیقت بن رہا ہے۔ ایک دوسرے کو اور بہتر طریقے سے جاننے اور سمجھنے کا عمل تیز تر ہوا ہے اور اس میں اپنی پہچان و شناخت قائم کرنے کی خواہش و ضرورت بھی۔ بر وقت اکثر لوگ کئی زبانیں بولتے اور سمجھتے ہیں۔ دنیائے ادب میں جس عالمی ادب کا تصور بہت زمانے تک مبہم تھا اب اس کے امکان، اہمیت اور ضرورت کے نقوش زیادہ روشن ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے اس سلسلے کی درمیانی کڑی ترجمہ ہے۔ تقابلی ادبیات کے فرانسیسی نژاد امریکی پروفیسر ایلبرٹ گیرارڈ نے اپنی مایہ ناز تصنیف WorldLiterature کے مقدمہ میں لکھا تھا کہ :

''عالمی ادب کے تصور کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے ترجمہ
ایک ناگزیر وسیلہ ہے۔''

یعنی ترجمہ وہ ذریعہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر کھلتے ہیں اور یہ عہدِ جدید کی ایک ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر ہم عالمی سطح کی علمی وادبی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہو سکتے۔اس کے لیے ہندوستان سمیت دنیا بھر میں کئی ادارے کام کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں کوئی بھی اہم تخلیق خواہ وہ کسی زبان میں ہو، کچھ دنوں میں دنیا کی بیشتر زبانوں میں دستیاب ہو جاتی ہے، جس سے وہ تخلیق کسی ایک زبان یا ملک تک محدود ہو کر نہیں رہ جاتی بلکہ عالمی ادب کا حصہ بن جاتی ہے۔

ترجمہ ادبی تنقید کی ایک شاخ یعنی تقابلی مطالعہ کو ایک نئی جہت عطا کرتا ہے۔اس تقابلی مطالعے کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں کہ ایک دور میں مختلف تہذیبوں کا طرزِ فکر اور احساس و جمالیاتی قدریں ایک دوسرے سے کتنی مماثلت یا اختلاف رکھتی ہیں۔کسی تہذیب میں رونما ہونے والے واقعات کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کا انداز بیان کیا ہے؟اور پھر مختلف ادوار میں فکری و جمالیاتی تحریکات جو ادب کو متاثر کرتی ہیں ان کا دائرہ محض کسی زبان و ادب تک محدود نہیں رہتا بلکہ ان سرحدوں کو پار کر کے دوسری زبانوں اور ان کی ادبیات تک پہنچتا ہے۔اس سے نئے موضوعات، اسالیب و طرز فکر کی نشوونما بھی ہوتی ہے۔کچھ سطحوں پر وہ مشترک بھی ہوتی ہیں اور مختلف بھی۔اور ان دونوں کے مطالعے سے ادب کا نہیں اس ادب کے دائرہ اثر میں آنے والے معاشرے اور اس کی حسیت کے بارے میں اہم نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔مثلاً اردو ادب میں ترقی پسند تحریک جس نے براہِ راست روس کی اشتراکی تحریک سے حرارت حاصل کی۔لیکن ہندوستانی حالات و معاشرے کی پیچیدگیوں کے سبب یہ کئی معنوں میں اس سے مماثل تھی اور کئی سطحوں پر مختلف بھی۔اسی طرح فٹز جیرالڈ کے خیام کی رباعی کے ترجمے سے فارسی ادب کا مغرب پر کیا ردّعمل ہوا یا مغرب نے خیام کی توضیح کس طرح کی، وہ فارسی نقادوں سے خاصی مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ترجمہ ایک طرف تو انسانی علوم میں اضافے اور ذہنی سرحدوں کو کشادہ کرنے کا ذریعہ بنتا ہے تو دوسری طرف اس کے ذریعے نئے نئے خیالات زبان میں داخل ہوتے ہیں اور زبان کی قوت اظہار میں نئے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔اور اس کے ذریعہ ایک بین الاقوامی انداز نظر پیدا ہوتا ہے کیوں کہ یہ ترجمہ بذات خود بین الاقوامی نقطۂ نظر کی پیداوار ہے۔

عالمی ادب کے اس دائرۂ عمل میں برصغیر کے اہم کلاسیکی ادیبوں اور خاص کر اردو ادیبوں کی نمائندگی بہت محدود ہے۔اس کی اہم وجہ اس عظیم ورثے کا دوسری زبانوں میں معیاری ترجمہ دستیاب نہ ہونا ہے جس کی وجہ سے وہ آج بھی دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ گرچہ چند مشہور اردو ادیبوں کے تراجم دوسری ملکی و غیر ملکی زبانوں میں ہوئے ہیں اور کچھ ادیبوں کے تراجم کیے بھی جا رہے ہیں لیکن سوائے چند تراجم کے ابھی کچھ خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آئے ہیں۔چند ہی اردو ادیب ایسے ہیں جن کے ایک یا ایک سے کچھ زیادہ تراجم موجود ہیں۔ نتیجتاً بین الاقوامی کلچر و تہذیب پر اس ادب کے اثرات مرتب ہوتے نظر نہیں آتے ہیں اور عالمی ادب میں ہمارا حصہ بالکل نہیں کے برابر ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ زبانوں کی مقبولیت پھیلاؤ اور اہمیت کا دار و مدار بڑی حد تک ان کے مفید ہونے اور علمی و ادبی سرمائے کو زیادہ سے زیادہ قارئین تک

پہنچانے کی اہلیت پر ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسن :

''اس میں کوئی شک نہیں کہ آج جب دنیا کی طنابیں کھینچ رہی ہیں اور عالم گیر سطح پر ایک اکائی بنتا جارہا ہے، کوئی بھی زبان ترجمہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تک نئے خیالات کا خون اور نئی آگہی کا نور رگ وپے میں سرایت نہ کرے زندگی دشوار ہے۔ یہی نہیں بلکہ آج کی دنیا میں زبانوں کی مقبولیت پھیلاؤ اور اہمیت کا دارومدار بڑی حد تک ان کے مفید ہونے پر ہے۔ اور افادیت کا پیمانہ یہ ہے کہ کوئی زبان اپنے زمانے کے علمی سرمایے اور ادبی ذخیرے کو کس حد تک اپنے پڑھنے والوں تک پہنچانے کی اہل ہے۔ اردو زبان کی خوش بختی ہے کہ اس نے ترجمے کی روایت کو ابتدا ہی سے اپنایا اور اپنے دریچے باہر سے آنے والی ہواؤں کے لیے کھولے اور بین الاقوامی کلچر کے نقوش سے اپنی محفل کو آباد کیا۔ اس دور تک آتے آتے وہ پرانی روایت بھی ناکافی ہوئی اور نئی دنیا کے تہذیبی سیاق وسباق نے برق رفتاری کے ساتھ ترجمے کے کام کو پھیلانے کو ناگزیر بنا دیا۔''

گلوبل ویلیج اور عالمی ادب کے تصور کو ExplosionofKnowledge نے مہمیز لگائی ہے اور اس روز افزوں علمی سیلاب کے باعث عالمی ادب اور GlobalVillage کے تصور کو ٹھوس حقیقت میں صرف اور صرف ترجمہ کے ذریعہ ہی بدلا جا سکتا ہے۔ TranslateorPerish پر منا سب رد عمل کا اظہار نہ ہوا تو اردو یا کوئی اور زبان دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے شانہ بہ شانہ نہیں چل سکے گی۔ اور عالمی ادب میں ہماری حصہ داری یا شناخت ناقابلِ اعتنا ہوگی۔ کیوں کہ نئی زبانیں قدیم زبانوں کی انگلی تھام کر ہی چلنا سیکھتی ہیں اور قدیم و جدید زبانیں اپنی ہم عصر زیادہ دولت مند زبانوں کا سہارا لیتی ہیں اور یہ عمل تاریخ و تمدن کے ایک باب کی طرح ہمیشہ سے جاری ہے اور ترجمہ ہمارا سب سے اہم ذریعہ ہے جس کی بدولت یہ عمل آج تک جاری ہے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے اور کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے۔ یہ عمل تمام جدید زبانوں کی طرح اردو کے ساتھ بھی کچھ خاص خصوصیات کا حامل ہے۔ کیوں کہ کسی زبان کی ترویج و اشاعت کے ساتھ ساتھ اس کو ادبی درجہ عطا کرنے اور ترقی پذیر زبانوں کی صف میں داخل کرنے میں ترجمہ کا بہت ہی اہم رول ہوتا ہے اور ترجمہ ہی کی بدولت وہ ایک باقاعدہ زبان بنتی ہے۔ اگر ہم اردو زبان اور اس کی ترقی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ بات بالکل ہی عیاں اور ثابت ہو جاتی ہے کہ ترجموں کی بدولت ہی اردو ایک باقاعدہ زبان بنی۔ بقول ڈاکٹر ظ۔ انصاری:

''اردو تو ایک باقاعدہ زبان بنی ہی ترجموں کی بدولت۔ ورنہ جب تک وہ کھڑی بولی کے روپ میں تھی اسے کسی بڑے قلم کار نے ادبی تصنیف کے قابل نہ سمجھا۔ بولی سے زبان تک کا طویل فاصلہ ایک صدی کے اندر طے کر لینے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ کہیں یہ ترجمے کتابی صورت میں ہوئے اور کہیں محض خیال، استعارے، اور اصطلاحوں کی صورت میں... بہر حال یہ مسلم ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ بھاشاؤں کے ترجمے اور ترجمان کو اردو زبان کی تعمیر اور تربیت میں بڑا دخل ہے۔''

مترجم کو چبائے ہوئے لقمے چبانے والا یا Traitor اور Immitator کہا جائے یا Maker، اس کی اہمیت وافادیت طلوعِ تہذیب سے اپنی جگہ مسلم ہے۔ کیوں کہ ترجمہ نے انسانوں اور قوموں کے درمیان حائل بہت سی دیواروں کو توڑا ہے اور ہر عہد میں نئے نئے افکار و نظریات کو ایک قوم سے دوسری قوم تک پہنچانے میں، ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے روشناس کرانے میں ترجمہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اقوام کے درمیان لین دین، افہام و تفہیم محض معاشی اور سیاسی سطح پر نہیں ہوتی، فکری اور تہذیبی سطح پر بھی ہوتی ہے اور ترجمہ کے ذریعہ ایک زبان دوسری زبان سے متعارف ہوتی ہے اور اس کے طریقہِ اظہار، نحوی ساخت، اور مزاج سے استفادہ کرکے وسعت حاصل کرتی ہے۔ بقول پروفیسر قمر رئیس:

> ''ترجمہ نے ہر عہد میں نئے نئے افکار و نظریات کو ایک قوم سے دوسری قوم تک پہنچایا ہے۔ ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے روشناس کرایا ہے۔ ترجمہ کے ذریعہ ہی ایک زبان دوسری زبان کے اظہارات اس کے مزاج اور نحوی ساخت سے متعارف ہو کر اپنا روپ رنگ بدلتی اور وسعت حاصل کرتی ہے۔ اکثر دوسری زبانوں کے شاہکاروں کا ترجمہ بھی ادیبوں کو نئے ادبی میلانوں اور فنی معیاروں کا احساس دلا کر نئے تجربات پر اکساتا اور نئے ادبی رجحانات کا محرک ثابت ہوتا ہے۔''

ترجمہ ایک مشکل اور کبھی کبھی ناممکن عمل ہے۔ اس کے باوجود بنیادی ضرورتوں کے پیشِ نظر اس امر مشکل کو کرنا ہی پڑتا ہے جس میں بے انتہا دشواریاں اور پریشانیاں درپیش ہوتی ہیں۔ مترجم کو خاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن بچا کر منزلِ مقصود تک پہنچنا ہوتا ہے۔ ادبی تراجم کے سفر میں بہت ساری پریشانیاں اور کلفتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ نثری ادب کے مقابلے شعری ادب کے تراجم میں پریشانیاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ علوم کے ترجمے میں صرف مواد کو منتقل کرنا ہوتا ہے اسلوب کو نہیں۔ جبکہ ادبی تراجم میں ایک تہذیبی سانچے کو دوسرے تہذیبی سانچے میں، ایک شعری و نثری روایت کو دوسری نثری و شعری روایت میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ جملوں کی ساخت، آہنگ اور اسلوب کی نیت کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے اور اسے بھی مطلوبہ زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ اصل زبانوں کے لفظوں کے جادو کو مطلوبہ زبان کی لفظیات میں جگانا ہوتا ہے جو کہ آسان امر نہیں ہے کیوں کہ زبانوں کی نفسیات، صوتیات، نحوی ترکیب، لغات، لہجے اور محاورے ایک دوسرے سے کافی مختلف ہوتے ہیں اور ان میں ترجمہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ مترجم کو کافی Chanllenges کا سامنا ہوتا ہے اور بیک وقت بہت سارے لوازمات کو ملحوظِ خاطر رکھنا ہوتا ہے۔ نثری ادب کے مقابلے شعری ادب کے تراجم میں یہ پریشانیاں دوبالا ہو جاتی ہیں، خصوصاً غزل کے ترجمے میں۔ نظم چونکہ کسی ایک خاص موضوع پر محیط ہوتی ہے اور نسبتاً طویل ہوتی ہے، شعری پابندیاں غزل کے مقابلے کم ہوتی ہیں یعنی مترجم کو اس کے سمجھنے اور ترجمہ کرنے میں نسبتاً آزادی اور آسانی ہوتی ہے، لیکن یہ آسانی غزل کے ترجمے میں نہیں ہوتی اور بہت ساری پریشانیوں اور چیلنجز کا سامنا ہوتا ہے۔ تجربہ کار، کہنہ مشق اور تخلیقی ذہن رکھنے والا مترجم ہی ان مسائل و مشکلات اور پریشانیوں سے نکل سکتا ہے۔ ترجمہ کی پریشانیاں، مسائل و مشکلات اس وقت مشکل تر ہو جاتی ہیں جب دونوں زبانوں کی صوتیات، ترکیبِ نحوی،

لغات، لہجے اور محاورے اور دونوں زبانوں کی تہذیب اور ان کا مزاج مختلف ہو اور ترجمہ ادب خصوصاً شعری ادب کا ہو۔ ایک اچھا مترجم زبان کی معنوی خصوصیات کو ملحوظ رکھتا ہے کیوں کہ دو زبانوں میں با معنی اظہار کے لیے ایک ہی طرح کی علامت نہیں ہوتی ہے جس سے ترجمہ میں معلومات کی مکمل اور من و عن ترسیل کا زیاں ہوتا ہے۔ Nida نے لکھا تھا کہ :

Distoration take place due to ethno linguistic design of communication

یعنی نسلی، لسانی نظامِ ترسیل میں تفاوت کے باعث دورانِ ترجمہ متبادل لانے میں پریشانیاں اور مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اردو شاعری کا انگریزی میں ترجمہ کرنے میں ان دقتوں، مسائل و مشکلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مشہور مصنف، شاعر، ناول نویس و افسانہ نگار، ناقد و مترجم شیو۔ کے کمار نے اپنی کتاب Best of Faiz کے مقدمے میں لکھا ہے کہ :

> "Translating Urdu poetry into English verse is a formidable task, especially when one undertakes to translate as difficult a poet as Faiz Ahmad Faiz whose innovated thought process often make his syntax very complex, almost intractable to rendition in a lnaguage whose diction, phrasing and rhythmic patterns are not tuned to oriental sensibility."

یعنی اردو شاعری کو انگریزی شعری قالب میں ڈھالنا ایک مشکل فعل ہے۔ خصوصاً فیض احمد فیض کی طرح کسی مشکل شاعر کے کلام کا ترجمہ، جس کے پر پیچ خیال و فکر کا عمل ان کے تراکیب اور جملوں کی ساخت کو پیچیدہ بنا دیا ہو اور جس کی ادائیگی کسی ایسی زبان میں جس کے لغات، محاورے اور آہنگ کی ترتیب و تنظیم مشرقی حسیت سے مطابقت نہ رکھتی ہو، عموماً اس میں ترجمہ مشکل ہوتا ہے۔ اسی مقدمے میں آگے چل کر شیو کے۔ کمار نے فیض احمد فیض کا جو کہ خود ایک اچھے مترجم تھے اور انگریزی وار دو زبانوں پر یکساں دسترس حاصل تھی، کا ترجمہ کے مسائل و مشکلات پر نظریہ نقل کیا ہے۔ فیض کے مطابق:

> "Translating poetry, even when confined to a cognate language with formal and idiomatic affinities with the original composition, is an exacting task, but this task is obviously for more formidable when the languages involved are as far removed from each other in cultural background,

rhythmic and formal patterns, and the
vocabulary of symbol allusion as Urdu and
English.''

یعنی شاعری کا ترجمہ چاہے ایک لسانی خاندان کی زبان (Cognate) میں ہو جو اصل تخلیق کے ساتھ اصولی اور محاوراتی قربت رکھتی ہو ایک دقت طلب عمل ہے۔ اور یہ عمل مزید مشکل ہو جاتا ہے جب اصل و مطلوبہ دونوں زبانیں تہذیبی پس منظر، آہنگ، صرفی و نحوی اصول، اشارہ و علامت کی لفظیات، تشبیہات و استعارات میں اردو انگریزی کی طرح ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف اور بعض صورتوں میں متضاد ہوں۔

ترجمہ کا عمل فی نفسہٖ بہت مشکل ہے۔ ترجمہ جب سائنس کا ہو، تاریخ کا یا اور دوسرے علوم و فنون کا ہو تو کسی قدر آسان ہو جاتا ہے لیکن شاعری کا ترجمہ بہت ہی مشکل ہوتا ہے کیوں کہ شاعری میں الفاظ، صرف معلومات یا محض تصورات پیش نہیں کرتے بلکہ ایک خاص فضا اور کیفیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اس خاص فضا اور کیفیت کو معلومات اور تصورات کے ساتھ دوسری زبان اور دوسری تہذیب کے سیاق و سباق میں بٹھانا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے معلوماتی ترجمہ کے برعکس شاعری کا ترجمہ سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ خصوصاً کسی ایسی زبان میں جس کا اصل زبان سے یا متن سے کوئی لسانی رشتہ نہ ہو اور دونوں زبانوں میں اختلاف ہو اور الگ الگ ماحول میں پروان چڑھی ہوں اور دونوں زبانوں میں فن شاعری کے اصول جدا جدا ہوں اور دونوں کی شعریات بالکل مختلف ہوں۔ اس لیے شاعری کا ترجمہ شاعری ہی میں کرنا بہت ہی مشکل اور جوکھم کا کام ہے۔ ان ہی مشکلات کے باعث ترجمہ کے بارے میں مختلف دانشوروں کے مختلف و متضاد اقوال ہیں جیسے والٹیر (Voltaire) کا کہنا ہے کہ:

''تراجم کسی تخلیق کی کمی میں اضافہ کرتے ہیں اور اس کے حسن کو تہ و بالا کرتے ہیں۔''

بیرو (Barrow) کا ماننا ہے کہ :

''کسی ترجمے کی معراج یہ ہے کہ اس میں اصل کی بازگشت ہو۔''

سائج (Syege) لکھتا ہے کہ :

''ترجمہ اس وقت تک ترجمہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ اپنے الفاظ سے اصل شعر کا آہنگ نہ دے۔''

ایک کامیاب مترجم کے لیے ان کی پابندی لازمی قرار دی ہیں اور یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ مترجم کے اندر کون کون سی صلاحیتیں ہونی چاہئیں۔

الف) جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اس زبان کی لغت سے، اصطلاحات اور محاروں سے، کسی قدر ادبیات سے اور تھوڑی بہت تاریخ سے واقفیت اور نکھرا ہوا ذوق ضروری ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس زبان کی تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے اس زبان پر مترجم کو ماہرانہ عبور حاصل ہو۔ مثلاً خشونت سنگھ نے اردو ہندی اور پنجابی کی کئی ادبی تخلیقات کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ ترجمے کے مسائل کا انھیں پورا احساس ہے ان کا

کہنا ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے، مترجم کو اس پر عبور حاصل ہو اور جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے، اس کی تھوڑی بہت واقفیت کافی ہے۔ لیکن وہ دوسری ہی سانس میں اپنے تجربے بیان کرتے ہیں کہ علامہ اقبال کے ''شکوہ اور جوابِ شکوہ'' کا انھوں نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

> ''درِ خیبر (حجاز) اور درۂ خیبر (پاکستان اور افغانستان کی سرحد پر) کا فرق انھیں آسانی سے معلوم نہیں ہو سکا۔ نیز بحرِ ظلمات اور بحرِ اوقیانوس Atlantic Ocean کے سمجھنے میں بھی انھیں دقت ہوئی۔''

حفیظ جالندھری کی نظم ''ابھی تو میں جوان ہوں'' کے انگریزی ترجمے میں انھوں نے ترنم ہزار کو A ThousandMelodies لکھا ہے۔ جب کہ اس جگہ ''ہزار بلبل'' کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان اور بعض دوسرے ماہرینِ فن کا یہ خیال پوری طرح صحیح نہیں ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے، اس پر عبور اور جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کی تھوڑی بہت واقفیت کافی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مترجم کو دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہونا چاہیے۔

ایک ہی مترجم کا دو زبانوں پر بیک وقت عبور حاصل ہونا کافی مشکل شرط ہے اور ایسے مترجمین کی تعداد ''نہیں'' کے برابر ہو گی۔ اس لیے مترجم جس زبان سے ترجمہ کر رہا ہے اس زبان کے کتابی علم سے تھوڑی بہت یا جتنی زیادہ واقفیت ہو، اچھا ہے۔ تاکہ وہ اصل عبارت کے سیاق و سباق اور خیال کی نزاکتوں کو پورے طور سے سمجھ کر ترجمے میں منتقل کر سکے۔

ب) جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے اس پر ماہرانہ عبور حاصل ہو۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے یوں بیان کی ہے :

> ''... تصنیف کی زبان سے کہیں زیادہ قدرت اس زبان میں ہونی چاہیے جس میں ترجمہ کرنا مقصود ہے۔ یہاں تک کہ اس زبان میں خود لکھ لینے کی اچھی خاصی مشق اور اس زبان کا پہلو دار علم ہونا چاہیے۔ پہلو دار علم سے مراد یہ ہے کہ اس کے ماخذ کا جہاں جہاں سے وہ سیر اب ہوئی ہے ان سرچشموں کا، اس کے نشیب و فراز کا علم ہو۔ الفاظ کہاں سے آئے، کیونکر آئے، ان کے لغوی معنی کیا تھے، اصطلاحی معنی کیا ہو گئے اور کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ ان کے روزمرہ اور محاورے کیونکر بنے۔ انھیں مختلف موقعوں میں کیسے کیسے استعمال کیا گیا اور آئندہ کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان میں مختلف اوقات میں کیا تبدیلیاں ہوئیں اور ان تبدیلیوں کی بنیاد پر اور کیا تبدیلیاں ممکن ہیں۔ ان کی مدد سے اور نئے سانچے کیسے بن سکتے ہیں۔ ایک ہی معنی کتنے مفہوم اپنے دامن میں رکھتا ہے اور ایک ہی لفظ کو جب مختلف نسبتوں سے ادا کیا جائے تو اس کے لیے کتنے کتنے مختلف وزن کے الفاظ موجود ہیں۔''

ج) مترجم جس موضوع کا ترجمہ کر رہا ہے اس کی اس موضوع سے مناسب حد تک واقفیت ہونی چاہیے۔ کیوں کہ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی اصطلاح، ایک ہی ترکیب یا ایک ہی لفظ ادب میں کچھ اور معنی رکھتا ہے۔ معاشیات و نفسیات میں دوسرے ہی معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ اس لیے مترجم کو

چاہیے کہ وہ صرف اور صرف لغت پر توجہ نہ مرکوز کریں بلکہ خاص موضوع اور سیاق و سباق کی روشنی میں اصطلاحوں اور ترکیبوں کا ترجمہ کریں اور خاص موضوع کی کتاب یا مضمون سے گہری دلچسپی یا اس کے متعلق بنیادی معلومات رکھتے ہوں، تبھی اس موضوع کو ترجمہ کے لیے انتخاب کریں۔ بہتر بھی یہی ہے کہ مختلف ترجمہ کرنے والے اپنی دلچسپی اور اپنی پسند کے مضامین منتخب کرلیں اور ان ہی کا ترجمہ اپنے لیے مخصوص کرلیں کیوں کہ اس میں مترجم اور قاری دونوں کا فائدہ ہے اور اصل تصنیف بھی متاثر نہیں ہوتی۔

فنّ ترجمہ کے ماہرین کے درمیان بھی اختلاف کئی سطحوں پر پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ مختلف ماہرین فن نے جس طرح مترجم کے لیے مختلف شرطیں رکھی ہیں۔ ان شرائط میں کافی اختلاف ہے۔ یا کس کتاب کا ترجمہ کرنا چاہیے اور کس کا نہیں اور کس کتاب کو کیسے کرنا چاہیے۔ یہ اور اسی طرح کئی باتیں ہیں جن پر ماہرین کا کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ہے، بلکہ متنازعہ فیہ مسائل ان کے درمیان ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ ترجمہ کے اصول کیا ہیں اور ترجمہ کس طرح کرنا چاہیے یا ترجمہ کس طرح اور کیسا ہونا چاہیے اس پر ماہرین کی مختلف آرا ہیں اور یہ آرا ایک دوسرے سے کافی مماثل بھی ہیں اور مختلف و متضاد بھی ہیں۔ مثلاً ترجمہ کس طرح ہونا چاہیے یا ترجمہ کس طرح کرنا چاہیے اور قاری ترجمہ کو کس طرح لے یعنی ترجمہ کے بارے میں قاری کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟ تھیوڈر ساوری (Theodore Savory) نے The Art of Translation میں بارہ نکات کا ذکر کیا تھا جن سے مترجم پر عائد ذمہ داریوں کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ وہ بارہ نکات درج ذیل ہیں:

☆ ترجمہ میں اصل متن کے الفاظ کا ترجمہ ہونا چاہیے۔
☆ ترجمہ اصل متن کے معانی و مفاہیم پر مشتمل ہونا چاہیے۔
☆ ترجمہ کو اصل تصنیف کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
☆ ترجمہ کو ترجمہ ہی کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
☆ ترجمہ میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہیے۔
☆ ترجمہ کو مترجم کے منفرد اسلوب کا نمائندہ ہونا چاہیے۔
☆ ترجمہ کو اصل متن کے زمانے تحریر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
☆ ترجمہ کو مترجم کے زمانے تحریر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
☆ ترجمہ میں اصل تصنیف سے حذف و اضافہ کیا جاسکتا ہے۔
☆ ترجمہ میں اصل متن سے حذف اور اضافہ کبھی ممکن نہیں۔
☆ نظم کا ترجمہ نثر میں ہونا چاہیے۔
☆ نظم کا ترجمہ نظم میں ہونا چاہیے۔

اگر ہم ان مندرجہ بالا نکات اور گذشتہ اوراق پر غور کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ترجمہ چاہے سائنسی یا ادبی مواد کا ہو اور اسے لفظی، معنوی یا جمالیاتی قالب میں ڈھالنا ہو یا لغوی، صوتی، استعاراتی اجزا یا ابعاد کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے کی کوشش ہو سب کے الگ الگ اصول اور ضابطے ہیں اور ان کو پرکھنے کے مختلف اصول اور پیمانے ہیں۔ ترجمہ کے ناقدین مترجمہ عبارت یا کتاب کو ان ہی اصول و ضوابط پر پرکھنے

کی کوشش کرتے ہیں اور ادبی معیار قائم کرتے ہوے مختلف فنون کے تراجم میں درپیش مختلف پریشانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔اور ترجمہ کی اصل غایت یعنی زبان وبیان کی نئی جہتوں، تجربات کی نئی سمتوں اوراحساسات کے نئے رنگوں کو دیکھنے اور سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے ترجمہ کی اصل غایت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :

> ''ترجمے کا مقصد پایانِ کاردوزبانوں کے مابین تہذیبی فصل یعنیBarrier کو لمحاتی طور پر ختم کرنا اور مخصوص کلچروں کی مختلف المرکزیت یعنی Eccentricity کوفی الوقت محو کرنااور باہمی لسانیاتی زرخیزی کووجود میں لاناہے۔ایسا کرنے میں اگر قطعیت کا حصول ممکن نہ بھی ہوتب بھی صحت کے قریب قریب پہنچنے کی کوشش یعنیApproximation بہرحال ضروری ہے۔کسی بھی زبان کے محاوروں کو مردہ استعاروں کانام دیاگیاہے اور استعارے چاہے وہ توانا اور متحرک ہوں یا منجمد مضمحل اور یخ بستہ ،وہ پیداوار ہوتے ہیں مخصوص تہذیبی ماحول اور آب وہوا کے۔اور مترجم کا کام دراصل اس تجربے کی تشکیلِ نو اور ترسیل ہے جس نے کسی زبان کے مزاج اور رنگ روغن کو جنم دیا ہے۔''

# کتابیات

01- پروفیسر محمد حسن: نوعیت اور مقصد، مشمولہ قمر رئیس (مرتبہ) ترجمہ کا فن اور روایت، تاج پبلشنگ ہاؤس، 1974ء
02- پروفیسر اسلوب احمد انصاری؛ترجمہ کا عمل مشمولہ نقد و نظر علی گڈھ 1987ء
03- ڈاکٹر ظ۔انصاری: ترجمے کے بنیادی مسائل، مشمولہ خلیق انجم (مرتبہ) فن ترجمہ نگاری، ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی، 1995ء
04- کلیم الدین احمد: ''فرہنگ ادبی اصطلاحات''، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1987ء
05- سید ضیاء اللہ: ''اردو صحافت، ترجمہ وادارت''، کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور، 1994ء
06- وحید الدین سلیم: وضع اصطلاحات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی
07- بلال احمد زبیری: ''سماجی علوم کا ترجمہ مسائل و مشکلات'' مشمولہ اعجاز راہی (مرتبہ) اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1986ء
08- George Steiner (1978) On Difficulty and Other Essays, Oxford University Press, London,
09- S. R. Faruqi "Language, Literature and Translation" in
10- R.S. Gupta (ed) Literary Translation, Creative Books, New Delhi, 1999,

معشوق احمد (کولگام)

# ڈاکٹر ریاض توحیدی کے افسانوں میں کشمیر

ایک عہد میں چند ادیب ہی ایسے پیدا ہوتے ہیں جو اپنی قابلیت اور صلاحیت کے بل بوتے پر ادب میں مشہور، فائزالمرام اور قارئین کے دلوں میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ علم و ادب کی دنیا میں اپنی منفرد پہچان بنانا اور اپنے قارئین کا حلقہ وسیع تر کرنے میں محنت، مطالعہ، تخیل، فکر و سوچ اور منفرد اسلوب چاہیے، تب جا کر کامیابی و کامرانی اور تحریرات و تخلیقات ادبِ عالیہ میں شمار کرنے کے لائق ہوتی ہیں۔ اس کے لیے جو پیمانے ناقدین نے مقرر کیے ہیں، ایک ادیب کو ان معیارات کی کسوٹی پر کھرا اترنا پڑتا ہے۔

اردو افسانے کی بات کی جائے تو اس کے جو مختلف ادوار ہمارے سامنے آتے ہیں، ان میں بہت سے نام ایسے ہیں جنھیں بہت جلد مقبولیت حاصل ہوئی۔ جنہیں قبول عام حاصل ہوا انہوں نے افسانے کو کچھ نہ کچھ ضرور دیا۔ اردو افسانہ کو پریم چند نے گاؤں کی بھینی بھینی خوشبو اور کھیت کھلیانوں کی بو باس دی۔ سعادت حسن منٹو نے افسانے کو طوائف کی زندگی کے شب روز دیے اور جنس کو بے باکی سے برتنے کا انداز سکھایا۔ کرشن چندر نے رومانوی فضا اور اظہار کی مختلف صورتیں عطا کیں۔ راجندر سنگھ بیدی نے ملائم احساس اور جزئیات نگاری سے نوازا۔ انتظار حسین نے اردو افسانے کو علامتی اسلوب اور داستانوی فضا دی۔ ان بین الاقوامی شہرت یافتہ افسانوں نگاروں کے علاوہ وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والے فکشن نگاروں نے اردو افسانے میں یہاں کے کہساروں کی خوبصورتی، آبشاروں کا رم جھم برسنا، حسین نظاروں کی منظر کشی، سسکتے لوگوں کی آہیں، کرب انگیز فریاد، مہندی لگے ہاتھوں کا پھیکا پن، بوڑھے کندھوں پر جوانوں کے جنازے جیسے موضوعات کو برتا۔

یہاں کے افسانہ نگاروں میں کچھ گمنام رہے اور کچھ نے بہت جلد قبولیت اور پذیرائی کے پائدان طے کیے۔ پریم ناتھ پردیسی سے لے کر نور شاہ تک۔ ایسے بہت سارے نام سامنے آتے ہیں جنہوں نے نہ صرف کامیاب افسانے لکھے بلکہ اپنا انفرادی مقام بھی بنایا۔ ان کی بعد کی نسل کے افسانہ نگاروں میں ایک معتبر نام ڈاکٹر ریاض توحیدی کا ہے۔ انہوں نے اپنے منفرد افسانوی اسلوب، فکشن تنقید اور جدید موضوعات کو افسانوی پیکر میں ڈھالنے کی وجہ سے نہ صرف کشمیر بلکہ اردو کی افسانوی تاریخ میں اپنی ایک مخصوص شناخت بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

ادب کے افق پر یہ درخشندہ ستارہ چہار جانب روشنی پھیلا رہا ہے، جس کی وجہ سے یہ ادبی حلقوں میں نہ صرف اپنے منفرد اسلوب اور دلکش انداز بیان کی وجہ سے معروف ہیں بلکہ شہرت اور بلندی کے اس مقام

تک جا پہنچا ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے ریاضت، تخلیقی صلاحیت اور فنی ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری نہ صرف تحقیق و تنقید کے اسرار و رموز سے آگاہ ہیں، جس کے جوہر وہ جہان اقبال، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بحیثیت اقبال شناس اور معاصر اردو افسانہ تفہیم و تجزیہ میں دکھا چکے ہیں، بلکہ افسانہ لکھنے کے فن کے استاد بھی ہیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے ابھی تک منظر عام پر آ چکے ہیں، کالے دیوؤں کا سایہ اور کالے پیڑوں کا جنگل۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری کی افسانہ نگاری اور ان کی تخلیقی سرگرمیوں سے متعلق وادی کشمیر کے ایک معتبر افسانہ نگار نور شاہ اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''ڈاکٹر ریاض توحیدی نے اپنی تخلیقی سرگرمیوں کا آغاز اس وقت کیا جب کشمیر پر آشوب دور سے گزر رہا تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس دور کے بہت سارے حالات، واقعات اور بہت ساری باتیں ان کے ذہن میں جگہ بنا گئیں۔ ان کی اکثر کہانیوں کے کردار انسانی زندگی کی تلخیوں، الجھنوں اور ناکامیوں کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ بہتر اور خوشحال مستقبل کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔'' (پیش لفظ: کالے پیڑوں کا سایہ از نور شاہ)

مذکورہ اقتباس کے پیشِ نظر جب ڈاکٹر ریاض توحیدی کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کے بیشتر افسانوں میں کشمیر نظر آتا ہے۔ انہوں نے ایک محبِ وطن اور خوددار ادیب کی طرح اپنے افسانوں میں نہ صرف کشمیر کے رنج والم کی دلدوز کہانیاں لکھی ہیں بلکہ وہ افسانے کے ذریعے کشمیر کی حالتِ زار کا پیغام دنیا تک پہنچانے میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ ایک جینوین افسانہ نگار کی حیثیت سے کشمیریوں کے درد و کرب، افراتفری، دکھ درد، بے چینی، گمشدہ افراد کے گھر والوں کی حالتِ زار، اپنوں کے انتظار میں حسرتوں سے تکتی نظروں کو بیان کرتے ہوئے ایک حساس اور ہمدرد ادیب کا حق بھی ادا کر دیا ہے۔ جس کا اشارہ چند برس پہلے معروف نقاد پروفیسر قدوس جاوید نے یوں کیا تھا:

> ''ریاض توحیدی کو اردو افسانہ کی روایت، شعریات اور موضوعاتی اور اسلوبیاتی رویوں کی آگہی ہے۔ لہذا انہیں اپنی سوچ و فکر اور تخلیقیت کے سرمایہ کو نہ صرف محفوظ رکھنا ہے بلکہ اسے اور بھی زیادہ مضبوط و مستحکم بھی کرنا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو صرف کشمیر ہی نہیں بلکہ اردو کی عام بستیوں میں بھی بحیثیتِ افسانہ نگار ریاض توحیدی اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ (مضمون: کالے دیوؤں کا سایہ)

انتظار حسین کے بعد اردو افسانے میں علامتی اسلوب بہت کم ادیبوں نے اپنایا۔ جس بات کو زبان پر لانے سے خوف اور کھٹکا لگے، اس کو علامت کے تخلیقی غلاف سے ڈھانپ کر پیش کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی نے بھی علامت نگاری کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا، جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان کے علامتی افسانوں میں کالے پیڑوں کا جنگل، کالے دیوؤں کا سایہ، سفید ہاتھی، سفید تابوت، سفید خرگوش اور کالے دیو، سفید جنگ، ہائی جیک، گلوبل جھوٹ، کشمیر نواز، درد کشمیر وغیرہ علامتی افسانے کی بہترین مثالیں ہیں۔

> ''زمینِ حسن خیز کی پرسکون و جان بخش فضائیں، قرنوں سے، کالے دیوؤں کے آسیب سے سحر زدہ تھیں۔ یہ آفت زدہ وادیِ کشمیر نواز کے سنہرے خوابوں کی حسین تعبیر تھی اور اس کی ستم زدہ نسل، ایک مدت سے، کالے دیوؤں کے حکمِ جابری کی تابعداری کرتے ہوئے جھیل

ولر کی منجمد سطح کے اوپر ننگے بدن آسمان تلے جان لیوا سردی میں برف کے بت بنی ہوئی تھی۔'' (افسانہ: کشمیر نواز)

''سفید ہاتھی آندھی کی طرح ان کے گلستانوں کی طرف بڑھ رہے تھے اور ان کے کھیت کھلیانوں کو تباہ کرتے جا رہے تھے۔ وہ اپنی لمبی لمبی سونڈوں کی بدبودار سانسوں سے ان خوشبو دار چمن زاروں کو زہر آلود کرتے جا رہے تھے اور اپنے پتھر جیسے بھاری پاؤں سے ان چمن زاروں کے رنگ برنگے پھولوں کو مسل رہے تھے۔'' (افسانہ: سفید ہاتھی)

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری مسلسل اردو افسانے اور افسانوی تنقید کے گیسو سنوار رہے ہیں۔ اُن کے افسانے نہ صرف کشمیر کے ادبی رسائل و جرائد کی زینت بنتے ہیں بلکہ ملکی اور بین الاقوامی سطح کے رسائل و جرائد میں بھی چھپتے رہتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کشمیر کی ستم زدہ قوم کی آہوں، نالوں، سسکیوں، المناکیوں اور گردوپیش کے مظالم کی تصویر کشی کے حقائق کو فن کا جامہ پہنا کر فنی مہارت اور لوازمات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ زبان و بیان صاف، شائستہ اور اغلاط سے پاک ہے۔ واقعات کو تخیل کی پرواز سے پر اثر انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اردو کے بلند پایہ ناقد پروفیسر حامدی کاشمیری کے بقول:

''ان پر (یعنی ریاض توحیدی پر) حقیقت نگاری کا اسلوب حاوی نہیں، وہ جانتے ہیں کہ فن کے رموز کیا ہیں اور ان کو اچھی طرح لفظوں میں منتقل کرتے ہیں۔ ریاض توحیدی کو زبان و بیان پر پورا عبور حاصل ہے۔ وہ افسانے کے واقعات کو بہت حد تک فرضیت میں مبدل کرتے ہیں اور یہی ان کے افسانہ نگاری کی پہچان ہے۔'' (کالے دیوؤں کا سایہ: حامدی کاشمیری)

ڈاکٹر ریاض توحیدی ایک بہتریں انسان، دیدہ ور نقاد، باصلاحیت اور منجھے ہوئے افسانہ نگار اور ادیب ہیں۔ انہوں نے اردو افسانے میں مقامی سطح سے لے کر بین الاقوامی سطح کے موضوعات کو عمدہ اسلوب میں برتنے کے ساتھ ساتھ بے باک انداز سے فنی عکاسی کی ہے۔ وہ نئی نسل کے نمائندہ افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ شعور کو بیدار کرنے والا اور منفرد فکر کا حامل تخلیق کار ہیں۔ بقول پروفیسر حامدی کاشمیری:

''نئی نسل، جس کی نمائندگی ریاض توحیدی کر رہے ہیں، گہرے شعور اور فکر و نظر کی تازہ کاری کے اوصاف کی حامل ہیں۔ توحیدی کی انفرادیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ زہرِ ہلال کو قند کی صورت عطا کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔'' (تاثرات: حامدی کاشمیری)

ڈاکٹر صاحب کے افسانے ایک تازیانے کی طرح ذہن پر پڑتے ہیں اور فکر کو بیدار کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کے افسانے پڑھ کر نہ صرف فکر بیدار ہوتی ہے بلکہ قاری کو سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ کوئی کشمیری جب ان کے افسانے پڑھتا ہے تو اسے وہ اپنی ہی کہانی نظر آتی ہے۔ بڑی بے باکی، نڈرپن اور سچائی سے واقعات کو تخلیق کرتے ہیں۔ ریاض توحیدی ادب برائے تعمیر کے قائل ہیں۔ اپنے افسانوں سے لوگوں میں بیداری پیدا کرنے اور ان میں انقلابی روح پھونکنے کے قائل ہیں۔ وہ افسانے میں گل و بلبل کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ سچائی کی وہ جوت جلانا چاہتے ہیں جس کی لو مدھم اور دھیمی پڑ گئی ہے۔ ان کے خیال میں:

''اردو کے بیشتر افسانوں میں سچائی کو خاموشی کے غلاف میں چھپایا جا رہا ہے اور ظالم کے ظلم اور مظلوم کی مظلومیت دونوں سچائیوں کو خاموشی کے قالب میں بند کیا گیا ہے۔ جس تحریر

سے سوچ میں بدلاؤ نہیں آئے گا، انقلاب نہیں آئے گا وہ تحریر اثر پذیر قوت سے محروم رہ جاتی ہے۔" (چند باتیں: کالے پیڑوں کا جنگل: ڈاکٹر ریاض توحیدی)

کشمیر پچھلی کئی دہائیوں سے جس پر آشوب دور سے گزر رہا ہے اس کی عکاسی ڈاکٹر ریاض توحیدی کے کئی افسانوں میں نظر آتی ہے جن میں سنگ باز، کالے پیڑوں کا جنگل، کالے دیوؤں کا سایہ، ناکہ بندی، ٹوٹتی جوانیاں، قتل قاتل اور مقتول، ڈپریشن، ہوم لینڈ، چھوڑ دو، گمشدہ قبرستان، جنازے، مشن القدس، میرا کشمیر، ہمارے بچوں کو بچاؤ اور درد کشمیر وغیرہ افسانے شامل ہیں۔ افسانہ "سنگ باز" میں دو ہم جماعت دوستوں کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ گلستان ڈاکٹر اور بوستان انجینئر بننا چاہتا تھا۔ دونوں کے دل قوم کی محبت سے سرشار ہوتے ہیں۔ گلستان خان ڈاکٹر اس لیے بننا چاہتا تھا تاکہ اپنے قوم کے سیکڑوں زخمیوں کا علاج کر سکے اور بوستان شاہ کے انجینئر بننے کے پیچھے یہ خیال کارفرما تھا کہ وہ اپنے قوم کے تباہ شدہ مکانات کی تعمیر از سر نو کر سکے۔ دونوں معصوموں کا خواب ادھورا رہتا ہے۔ کیونکہ کالے دیوان کے جذبات کو برداشت نہیں کرتے ہیں اور انہیں ابدی نیند سلا دیتے ہیں۔ لیکن افسانے کا اختتام مایوس کن نہیں ہے بلکہ سیاہ رات کا خاتمہ ہونے اور اجالا پھیلنے کے پرامید پیام پر ہوتا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار زخمی طالب علم گلستان کے یہ الفاظ دیکھیں جو اسپتال میں دم توڑتے وقت غم زدہ ماں سے کہتا ہے:

"ماں! مجھے میرا زخمی دوست علاج کے لیے بلا رہا ہے۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا ہے۔
ماں! مایوس مت ہونا۔ اندھیرا بھاگ رہا ہے اور اجالا آ رہا ہے۔" (افسانہ: سنگ باز)

ابتر حالات کی وجہ سے آئے دن کے کرفیو اور بندیشوں کی وجہ سے یہاں کی عوام کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، پریشان حال اور حالات کے مارے لوگوں پر کیا کیا بیتی ہے، کو افسانہ "ناکہ بندی" میں موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف کے الفاظ میں:

"بنجر زمین کے بنجر ذہن آدھی باسیوں نے سرسبز اور شاداب وادی کے بے مثل مہمان نواز انسانوں کا دانہ پانی بند کر رکھا ہے۔" (افسانہ: ناکہ بندی)

بشر ملک کا پورا خاندان درہم برہم حالات کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ اپنے بچے کے لیے دودھ کے ڈبے کو بم کا نام دے کر اس کو ناحق قتل کیا جاتا ہے۔ ناکہ بندی سے ذہنی کوفت کے ساتھ معاشی بدحالی کے شکار بشیر ملک کے گھر چار ماہ کا بچہ بھوک سے بلک رہا تھا۔ ماں سے نہ رہا گیا وہ اس کو اسپتال لے جانے کی کوشش کرتے ہوئے درندوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتی ہے اور معصوم بچہ سمیت جان بحق ہوتی ہے۔ دخل یاب نے جنت نما ارض کو جہنم کا نمونہ بنایا ہے۔

موت کا ڈر، روز اٹھتے جنازوں سے پژمردہ کیفیات، بے یقینی، زندگی کے پیچھے تیزی سے دوڑتی موت، ذہنی تناؤ، ویرانی کے مناظر، خون ٹپکتی لاشیں، خوشحالی کے خواب اور گھر کے اندر ہی محصور اور قیدی ہونے کا تذکرہ افسانہ جنازے میں کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ اس آفت زدہ بستی کی روداد سنا رہا ہے جہاں طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک جنازے اٹھتے رہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اگر کشمیر کو دیکھنا ہو تو ڈاکٹر ریاض توحیدی کے افسانوں کو دیکھنا پڑے گا۔ ان کی کہانیوں میں کشمیر کا درد و کرب، ظلم و تشدد، محکومی و بے بسی، پسماندگی اور سماجی ہم آہنگی کا فنی مرقع پرتاثیر انداز سے

نظر آئے گا۔ ریاض توحیدی کے افسانے مزاحمتی افسانے کی نمائندہ مثال ہیں۔ان کے افسانہ کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر محمد اسلم اپنے مضمون Oozing Wounds میں لکھتے ہیں :

"Dr Tawheedi Has used an appropriate expression to highlight the plight and pathos that Kashmiris have gone through endlessly for ages now."

جہاں اردو کی بستیاں آباد ہیں ڈاکٹر ریاض توحیدی کی تخلیقات کو دیکھ کر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آنے والے وقت میں ان کے ادبی قد میں مزید اضافہ ہوگا۔

قُرب عباس

# اپرنا

''محبت میں تم تن کی سیما کو پار کیے بنا من کی دنیا تک نہیں پہنچ سکتے اور پھر تم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے کتنے آزاد ہو، تمہارا ساتھی کتنا آزاد ہے اس بات کا پتا تو بعد میں ہی چلتا ہے۔'' یہ جملہ اپرنا نے شیتل کے گھر پہلی ملاقات میں کہا تھا۔

شیتل نے اپنی پرانی دوست اپرنا کے نیو جرسی منتقل ہونے کے بعد اُسے کھانے پر بلایا تھا اور مجھے بھی فون کر دیا تھا۔ اپرنا سے میری وہ پہلی ملاقات تھی اور مجھے جتنی حیرت اس کے عجیب انداز پر ہوئی اس سے کہیں زیادہ اس کے خیالات کو جان کر ہوئی تھی، وہ کہیں سے بھی اردو ہندی زبان کی روایتی سی طالب علم نہیں لگ رہی تھی۔

میری یہ شروع سے ہی عادت رہی ہے کہ میں جب کسی سے ملتا ہوں تو اس کی آنکھوں کو بغور دیکھتا ہوں کیونکہ آنکھیں باتوں کے معنی بتاتی ہیں، لفظ چاہے جو بھی ہوں، جیسے بھی ہوں۔ اور اس کی کالی آنکھیں گہری اور لمبی پلکوں کے حصار میں بہت چمک دار معلوم ہوتی تھیں، بھوئیں چہرے میں سب سے زیادہ ان آنکھوں کو واضح کرتی تھیں۔ وہ بولتی تھی تو اس کی آنکھیں اس کی باتوں کا ساتھ دیتی تھیں، وہ ہنستی تھی تو اس کی آنکھیں بھی کھل اُٹھتی تھیں۔ وہ حیران ہوتی تھی تو یہ حیرانی اس کی آنکھوں سے بالکل صاف جھانکتی دکھائی دیتی تھی۔ آنکھوں کے علاوہ اس کی دونوں کلائیاں اور گندمی رنگ کی انگلیاں تھیں جنہوں نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا، کلائیوں میں رنگ بہ رنگ Bands تھے اور انگلیوں میں بہت ساری انگوٹھیاں، وہ بالکل بھی مذہبی نہ تھی مگر انگوٹھیوں میں سے ایک گنیش کی انگوٹھی بھی پہن رکھی تھی۔ جب میں نے اس سے پوچھا تو اس نے مسکرا کر بتایا تھا:

''یہ میرے ایک عاشق کی دی ہوئی انگوٹھی ہے، بہت پیار کرتا تھا، اس کی ناک بہت بڑی تھی، ہاتھی کی سونڈ جیسی اور نام بھی گنیش تھا۔ اس لیے میں اس کو گن پتی کہہ کر بلاتی تھی۔ جب جب اس Ring کو دیکھتی ہوں تو مجھے اس کی شکل یاد آجاتی ہے۔ اس لیے میں نے پہن رکھی ہے۔ جو بھی تھا، Cute تھا!''

پھر اس نے اپنے بال سنوارے اور اسی طرح مسکراتے ہوئے دوبارہ بولی تھی:

''اِن فیکٹ! میرے ہاتھوں میں ساری انگوٹھیاں، یہ Bands سب عاشقوں کی طرف سے ہیں، وہ ملتے ہیں اور محبت میں ڈوب جاتے ہیں اور پھر کوئی نہ کوئی چیز دے جاتے ہیں۔ میں رکھ لیتی ہوں۔ لیکن سچی بتاؤں؟'' میں خاموشی سے اس کو سُن رہا تھا اور آنکھوں کو پڑھ رہا تھا، شیتل سب باتوں سے بے نیاز میز پر کھانا

لگانے میں مگن تھی۔ اپرنا ایک انگوٹھی کو گھماتے ہوئے کہنے لگی:

''مجھے ان سب سے محبت تھی، سب ایک ہی نظر میں اچھے لگے تھے۔ پر میرا معاملہ یہ ہے کہ میں زیادہ دیر کسی کے ساتھ رہ نہیں سکتی۔ ایک وقت کے بعد میرا سر بھاری ہونے لگ جاتا ہے، مجھے لگتا ہے کہ بس اب ختم ہو جانا چاہیے۔ بہت ہو گیا! بعد میں روتے ہیں، میرے پاؤں پڑتے ہیں اور میں کہتی ہوں یار جب ایک بندے پابندی کا من ہی نہ ہو تو اس کو کیسے محبت کروالو گے؟ بس جب تھی تب تھی، اور اب نہیں ہے تو نہیں ہے۔ بعد میں ہو گی تو بعد میں دیکھ لیں گے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اس رات ہماری فرد کی آزادی پر بات ہوئی تو اس نے بہت بے باک انداز میں کہا تھا:

''دیکھو پہلے معاملہ اور تھا، دیش کی آزادی کو ہی جنتا کی آزادی سمجھا جاتا تھا، دھرم کی آزادی کو انسان کی آزادی سمجھا جاتا تھا۔ پر اب دور بدل رہا ہے، اب نہ تو کسی دیش کو دوسرے دیش سے خطرہ ہے اور نہ ہی دھرم کی آزادی کوئی مطلب رکھتی ہے، اب انسان اپنے جسم اور آتما کی آزادی کے لیے لڑائی لڑ رہا ہے، اپنے آپ سے، سماج سے، دھرموں سے، ریت رواجوں سے۔ کون کس کے ساتھ Relationship رکھنا چاہتا ہے، کس کے ساتھ نہیں یہ فیصلہ اس کا ہی ہو گا، اس میں سماجی Judgement نہیں ہونی چاہیے۔''

اس پہلی ہی ملاقات میں میں کافی الجھ سا گیا تھا۔ وہ پہلی نظر میں مجھے پاگل اور بے پرواسی لڑکی دکھائی دی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ سنکی لگنے لگی اور پھر اس کے خیالات جان کر اندازہ ہوا کہ میرے تمام اندازے غلط ہیں، وہ بس ایک عام سی انسان ہے لیکن اپنی زندگی کو اپنے ڈھنگ سے جینے والی۔ میں اس سے چند ہی گھنٹوں میں کافی متاثر ہو چکا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے رُکی اور پھر ایک فون آنے کے بعد چلی گئی۔ میں نے شیتل کے ساتھ ٹیبل سے برتن اٹھاتے ہوئے کہا تھا:

''مجھے تمہاری دوست بہت پسند آئی۔''

شیتل نے جھٹ سے جواب دیا: ''سوچنا بھی مت! ایک تو یہ کہ تم اس کے ٹائپ کے نہیں ہو، وہ تمہارے ٹائپ کی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ کسی ریلیشن شپ پر قائم نہیں رہتی۔ مجھے نہیں یاد کہ اس نے ایک مہینے سے زیادہ کسی کے ساتھ کوئی ریلیشن رکھا ہو گا، بہت Complicated ہے شروع سے، کوئی بھی اس کو ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پاتا، یہاں تک کہ میں بھی نہیں، جو اس کے ساتھ کئی سال سے ہوں۔''

''کیوں Relationship میں اس کو کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''اصل میں اس کے اندر بہت گہرے اصول ہیں زندگی کے۔ کون کب کہاں کوئی غلطی کر دے اور اس کا دماغ گھوم جائے، وہی جانتی ہے۔''

''لیکن اس سے ملنے میں کیا حرج ہے؟''

''اوکے تو پھر کر لو ٹرائی، اس کے پیچھے لمبی عاشقوں کی لائن ہے، تم بھی اپنا راشن کارڈ لے کر اس لائن میں لگ جاؤ، کبھی تو باری آئے گی ہی۔''

میں نے قہقہہ لگایا اور شیتل بھی ہنس دی۔

اپرنا میرے حواس پر پوری طرح سے سوار ہو چکی تھی اور میں کئی دن سے ملنے کے بارے میں سوچ رہا تھا، آخر ہمت کر کے شیتل سے اس کا نمبر لے لیا اور کال ملائی۔

دونوں نے بہت سارا وقت کافی شاپ پر گزارا اور پھر یہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ تعلق میرے اندر بُری طرح سے برپا تھا اور میں پوری زندگی کے لیے اس کو اپنا ہم سفر دیکھنا چاہتا تھا مگر میرے ذہن میں ابھی تک اس کی کہی جسم کی سیما والی بات منڈلا رہی تھی۔ ایک دن ہم Pub سے باہر نکلے تو وہ کہنے لگی کہ آج میرے اپارٹمنٹ پر کیوں نہیں چلتے؟ وہاں کوئی Movie دیکھیں گے، میں نے بہانہ کیا تھا کہ مجھے جاب پر جلدی نکلنا ہے۔ تو وہ کہنے لگی کوئی بات نہیں، وہیں سو جانا اور پھر صبح ہوتے ہی چلے جانا۔

میں سیما کے اس طرف کھڑا تھا اور اگر اس مرتبہ بھی قدم بڑھا کر اس کو پار نہ کرتا تو کب کرتا؟

ہم دونوں کا ساتھ 23 دن تک رہا تھا اور پھر وہ میرے نام کی ایک اور انگوٹھی اپنی گندمی سی انگلی میں پہن کر اسی نامعلوم نگر میں واپس چلی گئی جہاں سے آئی تھی۔ شیتل کو بھی کچھ اتا پتا نہ تھا۔ گو کہ میں اس کے سابقہ سارے تعلقات کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا، اس کی طبعیت کے بارے میں بھی واقف ہو چکا تھا لیکن پھر بھی اس کے یوں اچانک چلے جانے سے ایک کسک سی باقی رہ گئی تھی۔ میں نے کچھ عرصہ تو اس کی تلاش میں اپنا وقت برباد کیا پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

قریب چار پانچ سال بیت جانے کے بعد ایک دن شیتل نے فیس بک پر میسج کیا اور پھر ہماری Chat شروع ہو گئی۔ بہت دیر باتیں ہوتی رہیں پھر اس نے آنے والے ہفتے کی شام اپنے گھر پر بلا لیا۔ اس شام شیتل کے گھر قدم رکھتے ہی میرے اندر ایک قیامت برپا ہوئی۔ اپرنا میرے سامنے ایک گورے کے ہاتھوں میں ہاتھ لیے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی، مسکراتے ہوئے قریب آئی اور گال پر بوسہ دینے کے بعد بولی:

''بہت بدل گئے ہو تم تو!'' میری مسکراہٹ میں روکھا پن تھا، میں وہاں سے کچن کی جانب گیا جہاں شیتل کھڑی تھی۔

''اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم نے اس کو بھی یہاں بلایا ہے تو کبھی نہ آتا۔'' شیتل مسکرا دی، کہنے لگی:

''ارے یار جب وہ اتنا سیریس نہیں لیتی ان چیزوں کو تم بھی مت لو۔ Chill کرتے ہیں نا! کیا تم ہندی فلموں کے ہیرو جیسے منہ پھلا کر کھڑے ہو گئے ہو۔''

ٹیبل پر کھانا لگا تو ہم سب بیٹھ گئے، اس کے ساتھ جو گورا تھا معلوم ہوا کہ وہ ایک آرٹش ہے اور فری لانسر رائٹر ہے، اس کا نام David تھا لیکن اپرنا بات کرتے کرتے اس کو Dev کہہ رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی دیکھ کر مجھے راجما چاول میں مرچ کچھ زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ اسی دوران مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈیوڈ اور اپرنا کو ایک ساتھ رہتے ہوئے ایک سال ہو چکا ہے، میرے لیے یہ ایک بہت حیران کن خبر تھی، چمچ میرے منہ میں جاتے جاتے رُک گیا:

''ایک سال؟'' اپرنا ہنس دی:

''کیوں عجیب لگا نا؟ مجھے بھی ڈیو بہت عجیب لگا تھا۔ Youknow، میں جب اس سے ملی تھی تو پہلے ہی اسے بتا دیا تھا کہ میرے ساتھ Problem ہے کہ میں زیادہ دیر کے لیے Relationship نہیں بنا سکتی، مجھے لگنے لگتا ہے کہ کسی نے مجھے Haunt کر لیا ہے اور میری آتما کسی جیل میں سڑ رہی ہے۔ مجھ سے Long-termRelationship نہیں نبھائے جاتے۔ تو پھر مجھے ڈیو نے کہا تھا کہ دونوں ساتھ رہتے ہیں اور پھر دیکھتے ہیں کہ کہاں تک ساتھ چل سکتے ہیں۔''

اپرنا بولتی رہی:

''اسی دوران میں دیکھا کہ ڈیو بہت الگ مرد ہے، جس کو میرے ہر ملنے جلنے والے سے کوئی جلن نہیں، کوئی اعتراض نہیں۔ میرا اس دوران ایک اور دوست سے بھی تعلق رہا مگر ڈیوڈ کی محبت میں کمی آئی نہ ہی اس عزت میں جو پہلے دن ہی میں نے اس کی نگاہ میں دیکھی تھی۔ بس ہم دونوں آزاد ہیں، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔''

اپرنا تو میرے لیے عجیب تھی ہی، ڈیوڈ اس سے بھی زیادہ عجیب دکھائی دیا، میں نے شیتل کو دیکھتے ہوئے اپرنا کی جانب جملہ پھینکا:

''ہم میں سے اکثر اپنی ہی تیار کی ہوئی جیل کے قیدی ہیں، مزے کی بات ہے کہ ہر ایک اپنے آپ کو اسی قید میں آزاد سمجھتا ہے۔ میرے سامنے اس وقت ایک ایسی لڑکی بیٹھی ہے جس نے کلائیوں اور انگلیوں میں اپنے اَن گنت عاشقوں کی دی ہوئی نشانیاں پہن رکھی ہیں، لاتعداد پنجروں کی قیدی خود کو آزاد سمجھتی ہے۔'' اپرنا میری بات سن کر مسکرادی اور شیتل سے میرے انداز میں ہی مخاطب ہوئی:

''اور دیکھو تو کون کہہ رہا ہے جو رات کو بالکل ننگا سوتا ہے، تن پر ایک بھی کپڑا ہو تو نیند نہیں آتی، کہتا ہے کپڑوں کے بوجھ کے بغیر سنسار میں آیا تھا، سونے سے پہلے وہی ہلکا پن بہت آنند دیتا ہے۔ اور اپنی اس مجبوری کو وہ بیچارہ خود بھی آزادی سمجھتا ہے۔'' میں اس کے جواب پر سر جھٹکنے کے سوا کچھ نہ کر سکا، شیتل نے قہقہہ لگایا، ڈیوڈ ہماری بات کو نہ سمجھ کر بھی مسکرادیا۔

''تم مقابلہ کرنا چاہ رہی ہو؟'' میں نے اپرنا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ اسکی مسکراہٹ ابھی تک ہونٹوں پر ناچ رہی تھی، کچھ توقف کے بعد وہ بولی:

''نہیں تو! میرا تمھارا کیا مقابلہ؟ یہ تو تم ہو جو میرے اندر پچھتاوے کو جنم دینے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''میں تمہارے اندر کسی پچھتاوے کو جنم دینا نہیں چاہ رہا۔ اگر ایسا کرنا چاہتا تو میرے لیے بہت آسان تھا کیونکہ کسی بھی عورت کے اندر محبت، دکھ اور پچھتاوے بہت جلدی جنم لے لیتے ہیں۔''

''ایسا تو نہیں ہے! محبت، دکھ، پچھتاوے تو بہت چھوٹی چیزیں ہیں اگر عورت نہ چاہے تمہارا بیج

بھی اس کی کوکھ میں نہ جانے پائے۔''

''فیمینسٹوں کی بکواس نعرہ بازی ہے، ایسا روز ہوتا ہے۔''

''ہوتا ہے پر تم جسے عورت سمجھ رہے ہو، وہ تو خالی ساڑھی ہے یا تمہارے پاکستان میں شلوار قمیض ڈوپٹہ۔ اصل عورتیں تو مجھ جیسی ہیں اور میں بالکل تم جیسی ہوں، من موجی اور جی بھر کے پاپی!''

اس روز شیتل کے گھر ہلکی پھلکی نوک جھوک اور طنز کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ دوبارہ سے چل پڑا۔ ہم کسی کافی شاپ پر ملتے یا پب میں، وہ ہمیشہ جذبات کے اظہار میں بہت آزاد تھی لہذا اس مرتبہ بھی اس نے مجھے اپنے اپارٹمنٹ پر بلانے میں پہل کی اور میں جانے تو لگا مگر ایک عجیب سا تناؤ تھا۔ اس کے ہاں ڈیوڈ بھی موجود ہوتا تھا۔ Living-room میں بیٹھ کر لکھ پڑھ رہا ہوتا تھا اور میرے آنے پر مسکرا کر Hello کہتا۔ میں جواب دیتا لیکن اس جواب میں ایک پھیکا پن ہوتا۔ میرے لیے یہ بالکل عجیب بات تھی کہ میں کسی لڑکی کے Boyfriend کی موجودگی میں اس کے گھر جاؤں اور پھر اس سے بھی حیران کن بات یہ تھی کہ ڈیوڈ میرے آنے یا جانے پر بالکل عام سے تاثرات چہرے پر رکھتا تھا، جیسے سب کچھ بہت معمولی ہو۔ جب کہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میرا اور اپرنا کا ماضی میں کافی گہرا تعلق رہ چکا ہے۔ اس کے اس قدر مطمئن ہونے پر مجھے نہ صرف تعجب تھا بلکہ ایک خفگی بھی۔ یہ شاید اس لیے تھا کہ میں ابھی تک پرانے تعلق میں پلنے والے کسی نہ کسی جذبے کے ساتھ اب تک بندھا ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ میں ڈیوڈ کو نہ دیکھوں، مجھ سے اس کا وجود برداشت نہ ہوتا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر وحشت سی ہوتی تھی کہ میں جسے چاہتا ہوں وہ کسی اور کے ساتھ بھی اپنے شب و روز گزار رہی ہے۔ جب جب یہ خیال میرے ذہن میں پوری شدت کے ساتھ طاری ہوتا تو مجھے اپرنا کا جسم بھی گندا، میلا کچیلا، باسی اور بدبودار سا محسوس ہونے لگتا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ کوشش ہوتی تھی کہ اول تو اس کے ہاں میں نہ جاؤں اور اگر جاؤں بھی تو بس ہماری بات چیت ہو اور پھر میں وہاں سے نکل جاؤں۔ شاید اس بات کو اپرنا نے بھی بھانپ لیا تھا اور ہمارے تعلق کے درمیان وہ جوش و خروش نہ رہا جو کبھی ہوا کرتا تھا۔

اس ٹوٹے پھوٹے سلسلے میں مزید کچھ سال کا خلا پیدا ہوا۔ شیتل نے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا اور مجھے اپنی شادی پر بلایا تھا۔ شیتل سے اب وہ دوستی رہی تھی نہ ہی اس کے ہاں آنا جانا تھا لیکن پھر بھی ایک عجیب ہارا ہوا تجسس مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں ایک مرتبہ جاؤں اور جا کر اپرنا کو دیکھوں۔ جانتا تھا کہ وہ جہاں بھی ہو گی شیتل کی شادی پر ضرور آئے گی اور ایسا ہوا بھی۔

میرا تجسس ختم ہوا، اپرنا بالکل ویسی تھی جیسی تین سال پہلے تھی۔ اس کے ساتھ ڈیوڈ ہی تھا جو کہ ایک چھوٹے سے بچے کو گود میں اٹھائے خوش گپیوں میں مشغول تھا۔ یہ سب میرے لیے مزید حیرت کا باعث بنا۔

مجھے دیکھتے ہی اپرنا نے اپنے مخصوص پُرجوش انداز میں مجھے پکارا اور تیز قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے میری جانب بڑھی، اسی طرح سے گال چوما اور قریب پڑی کرسی پر مجھے بٹھا کر خود بھی بیٹھ گئی:

''کہاں غائب ہو جاتے ہو تم؟''

''کہیں نہیں، یہیں تھا۔''

''ارے یار! عورت اور مرد میں ایک ہی رشتہ تو نہیں ہوتا، ہم اچھے دوست تو تھے ہی نا، تو اسی ناتے مل سکتے ہیں۔ تم تو ایسے بھاگے جیسے گدھے کے سر سے سینگ''

''شاید یہی اچھا تھا۔'' میں نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

اس نے اپنی گہری بھنوئیں سکیڑ کر پوچھا: ''کیوں کیوں؟ ایسا کس لیے؟''

''کیونکہ بس چھوڑو!''

''نہیں نہیں کہونا!''

''کیونکہ میں ایسے نہیں کر سکتا!''

''کیا نہیں کر سکتے؟''

''یہی کہ دوستی ووستی کچھ نہیں ہوتی، جس سے آپ محبت کرتے ہیں اور جب تک کرتے ہیں وہی ہوتی ہے، پھر کچھ نہیں ہوتا۔''

''اچھا، تو یعنی تمہیں اب محبت نہیں ہے اور کبھی تم دوست تھے نہیں؟''

''ایسا ہی سمجھ لو!'' میں نے قدرے کرخت لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا! تو یہ بھی اچھا ہے۔''

''مجھے خوشی ہے کہ تم اب تک ڈیوڈ کے ساتھ ہو!'' میں نے دور کھڑے ڈیوڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ڈیو کہاں جائے گا اور میں ڈیو کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گی؟ Youknow، اب تو کوئی بھی مرد نہیں بھاتا۔ ڈیو سے ہی محبت ہے اس کو مجھ سے ہے۔ کوئی بھی مجھے اس طرح Attract نہیں کرتا۔''

''اچھا؟ یہ کیسے ہو گیا؟'' میرے لہجے میں حیرت بھی تھی اور طنز بھی۔

وہ ایک پل کے لیے کچھ کہتے کہتے رُک گئی اور پھر مسکراتے ہوئے بولی:

''یہی ہونا تھا۔ کیوں کہ ڈیو محبت کرتا ہے۔ تم سارے مرد محبت تو کرتے تھے، وقت اچھا گزرتا تھا، چاہے ہم بستر پر ہوں یا کسی پب میں بیٹھے ہوں پر سب سے زیادہ الجھن اس وقت ہونے لگتی تھی کہ جب مجھے اپنی ملکیت بھی سمجھتے تھے۔ اتنے Relationships رکھنے کے بعد میری سمجھ میں ایک ہی بات آئی ہے کہ محبت میں کوئی کسی کی ملکیت نہیں ہوتا۔ ڈیو نے بس محبت کی اور کبھی اپنی ملکیت مجھ پر نہیں جتائی، میرے جسم پر، میرے خیال پر، میرے خواب پر کبھی کوئی پہرہ نہیں بٹھایا۔ مجھے میری ساری برائیوں اور اچھائیوں کے ساتھ اپنایا۔ اسی سے ملی ہوں تو جان سکتی ہوں کہ سچا ساتھی اپنی آتما اپنے پاس رکھتا ہے، آپ کی آپ کے پاس رہنے دیتا ہے بس زندگی کے سفر میں قدم سے قدم ملا کر چلتا ہے۔''

میں کچھ دیر کے لیے خاموش بیٹھا رہا اور پھر اپنی ساری حیرتوں کو ایک لمبی سانس کے ساتھ اپنے دماغ سے باہر نکالنے کے بعد کہا:

''خیر! میری سمجھ سے یہ سب باہر ہے۔'' وہ ہنس دی اور ڈیوڈ کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگی:

''ہاں! ہم لوگوں کے لیے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ ہم جن دیشوں سے آئے ہیں وہاں عورت اور مرد کے روپ صدیوں سے طے کر رکھے ہیں۔ آج بھی حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا جاتا ہے۔ مرد ایک چھوڑ چار عورتوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی پارسا ہے اور عورت کی گواہی تک پوری نہیں۔ دوسری طرف وہ سیتا ہو تو رام اس کو راون کی لنکا میں سے بچا کر نکال تو لاتا ہے پر پھر کہتا ہے کہ اگنی پریکشا دو، آگ میں سے گزر کر دکھاؤ، زندہ باہر آگئی تو تم نردوش ہو، مان لیا جائے گا کہ راون کے لیے تمہارے من میں کوئی خیال نہیں جاگا اور اگر جل جاؤ تو تم بدچلن ہو! اور رادھا کا کرشنا اتنی گوپیوں کے بیچ میں رہتا ہے پر وہ اس سے کوئی پریکشا نہیں مانگتی۔ ایسا لگتا ہے کہ صدیوں سے پاروتی، سیتا، رادھا، حوا، مریم سب ایک ہی عورت کے اوتار ہیں، اپنے اسی روپ میں رہے تو دیوی ہے، پوجنے کے لائق ہے اور اگر من کی بات کہے گی تو چنال اور رنڈی کے سوا کچھ نہیں سمجھا جائے گا! ایسی کتھاؤں پر یقین رکھنے والے کیسے مان جائیں کہ ہر تن کے بھیتر ایک من بھی ہوتا ہے، اس من میں الگ الگ خیالوں کے پیڑ اُگتے رہتے ہیں، بڑھتے رہتے ہیں، جن پر آشائیں پھوٹتی رہتی ہیں، پکتی ہیں اور ان آشاؤں کے پیچھے من مچلتے ہیں، اُن کو پانے کی ہر انسان کو اِچھا ہوتی ہے اور اس اِچھا کو پورا کرنا ہر انسان کا حق ہے۔ اسے کوئی دھرم، سماج یا دوسرا انسان نہیں روک سکتا۔''

میں اس کی باتوں میں مکمل طور پر محو ہو چکا تھا۔ خاموشی سے سُن رہا تھا، وہ بولتے بولتے چُپ بھی ہو گئی تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی تک بول رہی ہے۔ اس شور بھرے خاموش لمحے کے دوران میرے ذہن میں اچانک ایک سوال ابھرا:

''لیکن ہم کیسے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ محبت کے بیچ میں ملکیت نہیں ہے؟''

''میں نے کہا تو ہے کہ ہر من میں آشاؤں کے پیڑ اُگتے رہتے ہیں، اگر کسی کا ساتھ من کو بنجر کر دے تو مانو اس نے محبت کے ساتھ آپ کے من کی دھرتی پر اپنے نام کی ملکیت کا بورڈ لگا دیا ہے۔ پر اصل بات تو یہ ہے کہ محبت نہ من جیتنے کا نام ہے نہ ہارنے کا، کسی کو سونپنے کا نہ کسی سے ہتھیانے کا۔ یہ تو دو لوگوں کے تن اور من کا ملاپ ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں!''

میں نے سر اٹھا کر اپرنا کی جانب دیکھا، اس کی کالی آنکھوں کی چمک اب کچھ اور واضح ہو چکی تھی، وہ دو آنکھیں اس کے اپنے وجود کی مکمل تفسیر معلوم ہو رہی تھیں۔ ذرا نگاہ جھکائی تو دکھائی دیا کہ کلائیوں میں بینڈ اور انگلیوں میں انگوٹھیاں آج بھی موجود تھیں لیکن اس مرتبہ ان کا مفہوم میرے لیے کچھ اور ہی تھا۔ ہاں! گلے میں پہنا ایک لاکٹ رہ رہ کر چھاتی کے بوسے لے رہا تھا جس پر شاید ڈیوڈ لکھا ہوا تھا۔

سلیم سرفراز

# پُشت پر سوار بیٹا

شام کے وقت گرنے والی بجلی کے جھٹکے کا اثر اب تک برقرار تھا۔اس تیز جھٹکے سے اس کے وجود کی بنیاد ہی لرز گئی تھی۔اس کمزور بنیاد کے سہارے وہ کتنی دیر تک استقامت کے ساتھ زمین پر ایستادہ رہ سکتا؟

حسبِ معمول ٹرین کی چیکنگ کے بعد وہ پلیٹ فارم پر واپس چلا آیا۔ماربل سلائیڈ کی بنی ہوئی بنچ پر بیٹھ کر اس نے افسردہ نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ٹرین کو کلیرنس مل چکی تھی۔انجن کے آگے کھمبے پر سبز روشنی نظر آنے لگی تھی۔بیشتر مسافر کمپارٹمنٹوں میں سما چکے تھے۔ٹرین چل پڑی تو پلیٹ فارم پر ایک اضطرابی ماحول پیدا ہوا۔وہاں کھڑے رہ جانے والے بقیہ مسافر دوڑے اور کمپارٹمنٹ کی ہینڈل کو تھام کر پائے دان پر جھول سے گئے۔

ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم کی حدود سے باہر ہونے لگا۔رشتہ داروں اور عزیزوں کو وداع کرنے کے لیے آنے والے لوگوں کے ہلتے ہوئے ہاتھ رکے اور وہ لوگ واپسی کے لیے سیڑھی کی جانب بڑھ گئے۔پلیٹ فارم پر کسی قدر سنّاٹا چھا گیا۔بوجھل اور مضمحل سا سنّاٹا۔

اس نے خالی اور ویران آنکھوں سے پلیٹ فارم کو تکا۔یہاں اس نے اپنی زندگی کا بیش قیمت وقت گزارا تھا۔برسوں پہلے والد کی سبک دوشی کے بعد اس کی یہاں خلاصی ہیلپر کی حیثیت سے تقرری ہوئی تھی۔آج جبکہ اس کی سبک دوشی کو محض چار ماہ باقی رہ گئے تھے، وہ پروموشن پاتا ہوا فٹر بن چکا تھا۔اسے پلیٹ فارم کی ملازمت پسند تھی؛دلکش اور دلچسپ۔یہاں کی گہما گہمی میں وہ گھر کو بھول سا جاتا لیکن آج وہ ایسا نہیں کر پایا۔گھر کی یاد اسے رہ رہ کر کچوکے لگا رہی تھی۔وہ گھر جسے آباد اور خوش و خرم رکھنے کے لیے اس نے کتنی تگ و دو کی تھی۔

اس نے بنچ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں اور بند آنکھوں میں اپنی زندگی کے اچھے دنوں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔شادی کے ابتدائی ایام، خوب صورت اور وفا شعار بیوی، ان دنوں لاسٹ نائٹ کی شفٹ والی ڈیوٹی بے حد شاق گزرتی۔وہ جوڑی دار کی خوشامد کر کے یا اپنے ٹی ایکس آر سے کوئی بہانہ بنا کر دو یا تین بجتے بجتے گھر چلا آتا جہاں پھولوں کی ایک شاخ آنکھوں پر حملہ آور نیند سے برسرِپیکار اس کی منتظر ہوتی۔جلد ہی اس شاخ پر ایک نازک سا غنچہ پھوٹا تھا اور وہ اس کی خوشبو سے سرشار ہو اٹھا تھا۔

اس نے یاد کیا کہ اے شفٹ والی ڈیوٹی کر کے جب وہ گھر جاتا تو اس کا تین سالہ بیٹا اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور فوراً ہی اپنے پسندیدہ کھیل کی فرمائش کر بیٹھتا:

"پاپا! پاپا! گھولا بنیے"

وہ ڈیوٹی کا لباس اتارے بغیر اپنے گھٹنوں اور ہتھیلیوں کو زمین پر ٹکا کر گھوڑا بن جاتا اور اس کا بیٹا اس کی پشت پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگتا۔ اسے ناکام ہوتے دیکھ وہ ایک ہاتھ زمین سے اٹھا کر اسے سہارا دیتا اور وہ اس کی پشت پر سوار ہو جاتا۔ اس کے شانوں کو اپنے ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے اس کا بیٹا کہتا:

"چل میلے گھولے! ٹک ٹک ٹک.... چل میلے گھولے! ٹک ٹک ٹک...."اس کی معصوم اور پیاری آواز سنتے ہی اس کے جسم میں ڈھیر ساری توانائی بھر جاتی اور وہ گھوڑا بنا ہوا کمرے کا چکر لگانے لگتا۔ کافی دیر بعد اس کا بیٹا کمرے کا چکر لگاتے لگاتے جیسے تھک سا جاتا تو اس کی گردن میں اپنے ننھے بازوؤں کو حمائل کرتے ہوئے گہری محبت اور معصومیت سے کہتا:

"پاپا! مل جایئے!"اور اس کے جسم میں بریک لگ جاتے۔ لمبی اور تھکی ہوئی سانس چھوڑتے ہوئے وہ اپنے ہاتھوں کو آگے کی جانب بڑھاتا اور اپنے پیروں کو آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف سرکاتے ہوئے پیٹ کے بل زمین پر سیدھا لیٹ جاتا۔ بالکل خاموش اور بے حرکت۔ اس وقت اسے بے حد راحت محسوس ہوتی۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ دیر تک اسی طرح پڑا رہے۔ لیکن اس کی خاموشی اور بے حرکتی سے اس کا بیٹا جلد ہی اکتا جاتا۔ وہ اس کی پشت سے اتر کر اس کے سر کے پاس آتا اور اس کے چہرے کو پیار سے سہلاتے ہوئے ہمک کر کہتا:

"پاپا! زندہ ہو جایئے!" وہ آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو جاتا اور اس کا بیٹا تالیاں بجاتے ہوئے خوشی سے پکار اٹھتا:

"پاپا زندہ ہو گئے، پاپا زندہ ہو گئے!"

پھر یکے بعد دیگرے دو بیٹیاں ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی اولادوں کی پرورش و پرداخت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ دوسری بیٹی کی شادی ہوتے ہوتے وہ بالکل تہی دست ہو گیا لیکن اسے قطعی فکر نہ تھی۔ سبک دوشی کے بعد زندگی گزارنے کے لیے پنشن کی رقم ہی کافی ہوتی لیکن اس کا بیٹا....، اس کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ گہرے کرب سے بھر گیا۔ اس کی کس قدر خواہش تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے لیکن میٹرک پاس کرنے کے بعد اس نے تعلیمی سلسلہ ہی ترک کر دیا۔ شاید اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال آ بسا تھا کہ باپ کی سبک دوشی کے بعد تو اسے ملازمت مل ہی جائے گی اور اتنی تعلیم درجہ سوم میں بھرتی ہونے کے لیے کافی تھی۔ لیکن آدمی جس طرح سوچتا ہے کیا ٹھیک اسی طرح ہو پاتا ہے؟ ریلوے کے محکمے میں سرکاری سرکلر جاری ہوا اور ریٹائرمنٹ کوٹے میں تقرری ہی بند کر دی گئی۔ اب صرف کمپنشیشن گراؤنڈ پر ہی تقرری ممکن تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے بعد ہی اس کا بیٹا شکست خوردہ ہوا تھا اور پھر آہستہ آہستہ یہ شکست خوردگی تلخی و ترشی میں تبدیل ہوتی گئی تھی۔ اب وہ ذرا سی بات پر جھنجھلا اٹھتا۔ ماں سے سخت کلامی پر اتر آتا اور اسے اس طرح نظر انداز کرتا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

"کہاں کھوئے ہوئے ہو؟ نائن اپ کے آنے کا اناؤنسمنٹ ہو چکا ہے۔" اپنے جوڑی دار کی آواز پر

وہ چونکا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور پلیٹ فارم کو تکا۔ ویسا ہی انتشار تھا جیسا کہ ہر ٹرین کی آمد کی اطلاع ہونے پر دکھائی دیتا ہے۔ لوگ اپنے سامان کے ساتھ ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ اس نے سر کے اوپر لٹکی الیکٹرونک گھڑی کو دیکھا۔ ایک بج کر بارہ منٹ ہو رہے تھے۔ خلافِ توقع ٹرین اپنے مقررہ وقت سے پندرہ منٹ قبل ہی آ رہی تھی۔ ٹرینیں تو اکثر لیٹ ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی کوئی ٹرین وقت سے پہلے بھی پہنچ جاتی۔ ایسی حالت میں پلیٹ فارم پر اترنے والے مسافر خاصے مسرور نظر آتے اور جلد گھر پہنچ جانے کی سرشاری میں باہر نکلنے والی سیڑھی کی جانب تیزی سے لپکتے۔ اس کے قریب بنچ پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے دریافت کیا:

''نائن اپ کا صحیح وقت کیا ہے؟''

اس نے اس کے پریشان چہرے کو تکتے ہوئے جواب دیا: ''ڈیڑھ بجے!''

''پھر بی فور کیوں آ رہی ہے؟'' اس نے کسی قدر جھنجھلا کر کہا تو اسے حیرانی ہوئی:

''کیوں؟ تمھیں کیا پریشانی ہے؟''

''میرے پتا جی اب تک نہیں آئے۔ انہیں دیر سے آنے کی عادت ہے۔ میں نے اتنی ضد کی لیکن وہ بولے۔ تمھیں جلدی ہے تو جاؤ۔ بھلا ٹرین بھی کبھی وقت پر آتی ہے؟ اب ان بوڑھوں کو کون سمجھائے کہ کبھی کبھی جلد نہ پہنچنے سے کتنا نقصان ہو سکتا ہے؟''

نوجوان کے چہرے سے مترشح خفگی اور برہمی کو دیکھتے ہوئے اسے اپنا بیٹا یاد آیا اور اس کے ساتھ ہی آج شام پیش آنے والا واقعہ بھی جس نے اسے بے حد دل برداشتہ اور مشتعل کر دیا تھا۔ اس نے تو ہمیشہ اپنے بیٹے کی بہتری اور کامیابی کی خواہش کی تھی۔ پھر اسے یہ غلط فہمی کیسے ہو گئی کہ اس کی تمام پریشانیوں اور ناکامیوں کا وہی ذمہ دار ہے۔ وہ ایک ایثار پسند اور مخلص فرد تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے سارے لمحے اپنے خاندان کی خوشیاں خریدنے کے لیے قسطوں کی ادائیگی میں ہی صرف کیے تھے۔

''وہ برآمدے میں بیٹھا ہوا اخبار کی سرخیوں پر نگاہیں دوڑا رہا تھا کیونکہ شام کے دھندلکے میں باریک حروف پڑھنے میں نہ آ رہے تھے۔ اس کی بیوی سامنے ٹیبل پر چائے رکھ گئی تھی جس سے گرم بھاپ نکل رہی تھی۔ اخبار سے دھیان ہٹا کر اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور دھیرے سے ہونٹوں تک لے گیا تھا کہ اس کا بیٹا وارد ہوا۔ اس نے کنکھیوں سے اسے برآمدے میں قدم رکھتے ہوئے دیکھا۔ اچھا خاصا خوبرو نوجوان تھا لیکن چہرے پر پھیلی کرختگی کے باعث ساری دلکشی زائل ہونے لگی تھی۔ اسے تکتے ہوئے اس کے اندر محبت اور ہمدردی کی شدید لہر اٹھی۔ ناز و نعم میں پالے ہوئے بیٹے کے چہرے کے منفی تاثرات اسے قطعی اچھے نہ لگے۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ وہ تو کبھی اس طرح بے کار آوارہ گردی کرنے پر بھی معترض نہیں ہوا۔ وہ نوجوان اور سمجھدار ہو گیا تھا۔ اسے حالات کا تجزیہ کر کے خود ہی کسی مناسب راہ کا تعین کرنا چاہیے۔ ریلوے میں ملازمت نہیں ملتی نہ سہی اور بھی بہت سارے کام ہیں۔ اکثر وہ بیوی سے کہتا:

''اسے سمجھاؤ کہ کوئی کام کرے۔ اس طرح بے کار گھومتا رہا تو ذہنی اور جسمانی طور پر ناکارہ ہو

کر رہ جائے گا۔“

وہ بے بسی سے جواب دیتی کہ میں تو ہمیشہ کہتی رہتی ہوں لیکن وہ سنتا کب ہے؟ زیادہ اصرار کرنے پر کھینچ کر ایک ہی جواب دیتا ہے کہ پاپا تو کام کر ہی رہے ہیں۔ اور اس کے کانوں میں برسوں پہلے کی سنی ہوئی تتلاتی آواز گونجنے لگتی:

”چل میلے گھولے! ٹک ٹک ٹک ...... چل میلے گھولے! ٹک ٹک ٹک“

گھوڑے کی طرح اپنی پشت پر اپنے بیٹے کو بٹھا کر چکر لگاتے رہنے پر اسے کوئی تعرض نہ تھا لیکن کھیل یہیں تو ختم نہیں ہوتا۔

اس کا بیٹا اس کے وجود کو مکمل نظر انداز کرتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا تو اس نے افسردگی سے گہری سانس لی۔ کچھ ہی دیر میں اندر سے اس کے بیٹے کی تیز اور کرخت آواز آنے لگی۔ وہ اپنی ماں سے کسی بات پر الجھنے لگا تھا۔ کافی دیر تک اس نے تحمل سے کام لیا لیکن اس کی تلخ کلامی حد کو عبور کرنے لگی تو وہ اندر داخل ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے مداخلت کی تو وہ بری طرح برافروختہ ہو کر بولا:

”آپ کون ہوتے ہیں بیچ میں بولنے والے؟“

”کیا؟“ بے عزتی کے شدید احساس نے اسے بری طرح مشتعل کر دیا۔

”میں کون ہوتا ہوں؟ میں تمہارا باپ ہوں باپ!“

”چھوڑیئے بھی!“ اس نے سینے میں زہریلے تیر چبھونے والے انداز میں کہا:

”باپ ایسے ہوتے ہیں! خود غرض! اگر آپ میرے باپ ہوتے تو اپنی نوکری مجھے نہ دے دیتے۔“

وہ غصے کی زیادتی سے لرزتے ہوئے بولا: ”تمہیں معلوم نہیں کہ نوکری اب صرف ڈیوٹی اوقات میں مر جانے پر ہی ملتی ہے۔“

”تو مر جایئے!“ اس نے اتنی لاپرواہی اور سرد مہری سے کہا کہ وہ یک لخت پتھر کی طرح ساکت و جامد ہو کر رہ گیا۔

پلیٹ فارم پر ٹرین کی آمد سے اس کے خیالات منتشر ہوئے۔ اس نے لوہے کا تار اٹھایا، ٹارچ سنبھالی اور ٹرین کی دوسری سمت جانے کے لیے گارڈ کے ڈبے کی طرف بڑھا۔ آخری سرے پر پہنچ کر اس نے ٹارچ جلائی اور ریل کی پٹریوں پر اتر گیا۔ دوسری طرف جا کر اس نے بوگیوں کے جوائنٹ پر ٹارچ کی روشنی پھینکی اور نوک پر خمیدہ لمبے تار کی مدد سے ویکوم کو کھولا اور پھر آگے بڑھا۔ وہ یکے بعد دیگرے بوگیوں کے ویکوم کو کھولتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ درمیان میں ہی اس کا جوڑی دار اس سے آملا جو مخالف سمت سے یہی عمل کرتا ہوا آ رہا تھا۔

”چلو کام ختم ہوا۔“ جوڑی دار نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا تو اس پر ایسی نقاہت طاری ہو چکی تھی کہ وہ صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

''ٹرین کھلنے میں ابھی دیر ہے۔ میرا بیٹا بہت بیمار ہے۔ مجھے ٹی ایکس آر سے چھٹی لینی ہے۔ چلو آگے سے پلیٹ فارم پر چڑھتے ہیں۔''

''تم جاؤ! مجھے تکان محسوس ہو رہی ہے۔ ٹرین کھلنے کے بعد میں یہیں سے پلیٹ فارم پر چڑھ جاؤں گا۔'' اس نے اندھیرے میں بوگیوں کے طویل سلسلے کو تکتے ہوئے کہا تو اس کا جوڑی دار آگے بڑھ گیا۔ اور تنہا ہوتے ہی اسے اپنا بیٹا یاد آیا اور وہ ایک بار پھر غم وغصے سے بھر گیا۔ کیا اس کا یہ جارح اور خود پرست رویہ مناسب تھا؟ اس نے اپنے بیٹے کے ساتھ کب برا سلوک کیا تھا؟ اس کی یاد کے پردے پر وہ سارے لمحات تصویر کی مانند ابھرنے لگے جو اس نے اس کے ساتھ گزارے تھے۔ وہ لمحات جن میں اس نے اپنی بے لوث محبت اور شفقت بھرے جذبوں کو اس کے اوپر بے دریغ لٹایا تھا۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر وہ بری طرح تڑپ اٹھتا تھا۔ اس نے یاد کیا کہ ایامِ طفلی میں وہ ایک بار سخت بیمار پڑا تھا۔ جانے کون سا مرض تھا کہ ڈاکٹر تشخیص ہی نہیں کر پا رہے تھے۔ ان کی ناکامی پر اس کا دل بیٹھ سا گیا تھا۔ وہ رات رات بھر جاگ کر اس کی تیمارداری کرتا۔ اس کی بگڑتی حالت دیکھ کر ایسا مضطرب ہوتا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور ہاتھ دعاؤں کے لیے اٹھ جاتے۔ کسی کے کہنے پر وہ مسلکی اختلاف کے باوجود اپنے بیٹے کو حضرت شمس الدین بابا کے مزار پر لے گیا تھا۔ مزار کی جالیوں کو پکڑ کر اس نے ایسی گریہ وزاری کی تھی کہ مجاور کو مداخلت کرنی پڑی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں اس کا بیٹا مکمل صحت یاب ہو گیا تھا اور اس نے بے پناہ مسرت اور گہری عقیدت کے ساتھ مزار اقدس پر تازہ اور شگفتہ پھولوں کی چادر چڑھائی تھی اور دیگ نیاز دلا کر اپنے بیٹے کے ہاتھوں تبرک تقسیم کروائے تھے۔

اس نے اپنے دل کے نہاں خانے میں جھانکتے ہوئے جاننا چاہا کہ اپنے بیٹے کے لیے اس کے دل میں محبت اور شفقت کا جو دریا کبھی موجزن تھا، کیا وقت کی تمازت نے اسے بالکل خشک کر دیا ہے؟ جلد ہی کہیں دور سے دریا کی لہروں کا شور سنائی دینے لگا۔ آہستہ آہستہ بالکل نامحسوس طریقے سے اس کے دل میں پھیلا ہوا غم وغصے کا غبار چھٹتا گیا اور اس کے اندر سے بیٹے کے لیے مختص محبت کی تیز روشنی ابھر آئی۔ اسے لگا کہ وہ گھوڑا بنا ہوا کمرے کا چکر لگا رہا ہے۔ اس کی پشت پر سوار اس کا بیٹا چکر لگاتے لگاتے تھک سا گیا ہے اور اس کی گردن میں بازو حمائل کرتے ہوئے پیار اور معصومیت سے کہہ رہا ہے: ''پاپا! مل جایئے''

انجن نے آخری سیٹی دی اور ٹرین چلنے کے لیے تیار ہوئی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر اپنے گھٹنوں اور ہتھیلیوں کو زمین پر ٹکا کر گھوڑا بن گیا۔ لمبی اور تھکی ہوئی سانس بھرتے ہوئے اس نے ہاتھوں کو آگے بڑھایا اور اپنے پیروں کو آہستہ سے پیچھے کی طرف سرکاتے ہوئے پیٹ کے بل لائن پر اس طرح لیٹ گیا کہ اس کے جسم کا نصف حصہ ٹرین کے نیچے سما گیا۔ ٹرین چل پڑی۔ یہ کچھ سوچ کر اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو آ گئے کہ اس بار اس کا بیٹا کبھی نہیں کہے گا:

''پاپا! زندہ ہو جایئے!''

ترنم ریاض

# یہ تنگ زمیں

میں نے جب اپنے خریدے ہوئے خوبصورت کھلونوں کو ڈھیر کی شکل میں لاپروائی سے ایک کونے میں پڑا ہوا دیکھا تو مجھے دکھ سا ہوا۔ یہ کھلونے کتنے چاؤ سے لائی تھی میں اس کے لیے۔ یہ چھوٹا سا پیانو، یہ جلترنگ، یہ چھوٹی سی گٹار، چہکنے والی ربر کی بلبل، ٹیں ٹیں بولنے والا طوطا اور ڈرم بجاتا ہوا ٹیڈی بیئر اور سب سے بڑھ کر یہ Synthesiser جس میں سو قسم کی دھنیں تھیں، جن سے کئی اور دھنیں بن سکتی تھیں۔ جس میں موسیقی کے ہر آلے کی آواز تھی۔ مگر اس نے انھیں چھوا تک نہ تھا۔ وہ تو ایسے کھلونوں کا عاشق تھا۔ کیا وہ خود کو اب میرا نہیں سمجھتا یا اب اسے مجھ سے محبت نہیں رہی۔ وہ جسے میں نے دل کے ایک ٹکڑے کی طرح برسوں سینے میں چھپائے رکھا۔ وہ جس نے میری مجروح ممتا پر اُس وقت اپنی معصومیت کا پھاہا رکھا تھا جب میرے دامن میں کھلنے والا پہلا پھول چند سیکنڈ کے بعد ہی مرجھا گیا تھا۔ جب میرے ہونٹوں پر لوریاں صدا پانے سے پہلے ہی بے سُر ہو گئی تھیں اور روٹھی ہوئی نیند کو میں نصف شب تک رو رو کر، کروٹیں بدل بدل کر منانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ تب ایک سرد رات کے گیارہ بجے میرے شوہر اسے گود میں لیے ہوئے لوٹے۔ اس نے ٹویڈ کا دھاریوں والا ننھا سا پھرن پہن رکھا تھا اور مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنی غیر معمولی لمبائی والی منی منی پلکیں پھڑ پھڑا کر کسی روبوٹ کی طرح جلدی سے کہا تھا:

''آنتی مت لوئیے۔ میں آگیا۔ اب مت لوئیے''

اس کے انکل، جنھیں وہ ''اکل جی'' کہتا تھا، اسے راستہ بھر یہ ہی سکھا کر لائے تھے۔ میں مسہری سے اٹھ کر آنسو پونچھتی ہوئی ان کے قریب گئی اور اسے گود میں لے کر سینے میں چھپالیا۔ اُس کے سردی سے ٹھٹھرے چہرے کو میں نے جلتے ہوئے کلیجے سے لگالیا۔ میرے دل سے خون رسنا تھم گیا۔ اُس کے گھنگریالے بالوں کو میں نے آنسوؤں سے دھو دیا۔

''نہیں روؤں میں؟ کیا تم میرے پاس رہو گے؟ اپنی ماما کے پاس نہیں جاؤ گے؟ آنٹی کے ہی پاس رہ جاؤ گے؟ بولو!''

''ہاں آنتی! پاش رہ جاؤں گا۔ لوج لوج مجھ کو بکی اور چال کیٹ دو گے؟'' اس نے اپنا ادھ چبا چاکلیٹ منھ میں ڈالنے کی کوشش میں اپنے گال پر مل لیا اور خرگوش کی سی تیزی سے سر ادھر اُدھر ہلا کر پوچھا۔ پھر پھرن کی اُس جیب میں ہاتھ ڈال دیا جس میں کچھ اور چاکلیٹ اور بسکٹ تھے۔

میری تڑپتی ہوئی ممتا کو صبر آگیا۔

وہ میری بہن کا بیٹا تھا۔ اور میرے شوہر بظاہر میری تڑپ کو بہلانے اور اصل میں خود اپنے دل کے قرار کی خاطر اُس دن اُسے اُس کے گھر سے لے آئے تھے۔ اس کی قربت پا کر میں بھول گئی کہ میری ممتا کے ساتھ اتنا بڑا ناخوش گوار حادثہ پیش آیا تھا۔ بھولی نہیں بھی تھی مگر بہل ضرور گئی تھی۔ وہ مہینوں میرے پاس رہتا اور کبھی اس کی امی اسے لینے آتی تو باقاعدہ وعدہ کر کے جاتا کہ کب لوٹے گا۔ پھر میرے پاس آنے کے لیے ان کی ناک میں دم کر دیتا اور طے شدہ وقت سے پہلے ہی چلا آتا۔ اس کی ماں بھی اسے کچھ زیادہ نہ روکتی کہ میرا درد وہ جانتی تھی۔ وہ واپس آجاتا تو بہار آجاتی گھر میں۔ اس کی عادتیں بھی دل موہ لینے والی تھیں۔ فطرت کا اس قدر عاشق کہ ہر وقت باہر لان میں کھیلتا۔ کمروں میں تو جیسے اسے اپنا آپ مقید محسوس ہوتا۔ میری انگلی پکڑ کر کھینچتا ہوا، ننھے ننھے جوتے پہنے چھوٹے چھوٹے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر لے جاتا۔ کبھی پھولوں پر غور کرتا یا کسی تتلی کا پیچھا کرتا ہوا، کبھی گھاس میں چھپے مینڈکوں کو بھگاتا ہوا گیٹ سے باہر نکل جاتا۔ جہاں چنار کے بہت سے پیڑوں کے پرے جھیل نظر آتی تھی، وہاں پہروں ایک جگہ کھڑا جھیل کو دیکھتا رہتا۔ یا چنار کے بڑے سے تنے پر چھوٹا سا ہاتھ دھر کر گول گول گھومتا۔ یا اس کے کھوکھلے تنے میں چھپ کر مجھے تلاش کرنے کو پکارتا۔ میں کتنی بار اندر چلی جاتی کہ پیچھے پیچھے آتا ہوگا مگر مجھے پھر باہر جانا پڑتا اس کی تلاش میں، اور اسے اپنی دھن میں مگن ہری ہری گھاس پر لیٹا ہوا نیلے نیلے آسمان کو تکتا ہوا پاتی۔ وہ صبح سے شام کر دیتا کہ پرندے بولنے لگتے۔ کئی طرح کے پرندے چناروں کی اونچی نیچی شاخوں پر آبیٹھتے اور اپنے اپنے آشیانوں میں شب بھر چھپ جانے سے پہلے کچھ دیر ان ٹہنیوں پر ستاتے چہکتے ایک لطیف سا شور برپا کر دیتے اور وہ اُس میں کھو جاتا۔ مجھ سے ان کے نام پوچھتا اور یاد رکھتا۔ یہ بلبل ہے، یہ پپیہا ہے، یہ کستوری ہے، یہ ابابیل ہے، یہ فاختہ ہے، یہ مینا ہے...... اور ہر پرندے کی بولی پہچان لیتا اور ہو بہو نقل اتارتا۔ جب کوئی پرندہ نیچے کی ٹہنیوں سے اڑ کر اوپر گھنی شاخوں میں کہیں گم ہو جاتا تو وہ پہروں گھوم گھوم کر اسے تلاش کرتا۔ کوئی نیل کنٹھ پاس کی جھیل سے اپنی لمبی نیلی چونچ میں کوئی تڑپتی ہوئی روپہلی مچھلی آڑھی دبوچ کر لاتا اور اسے سیدھی نگل جانے کی دھن میں بار بار اگلنے لگتا اور ناکام ہو کر کسی اونچی موٹی سی ٹہنی پر اسے پٹخ پٹخ کر کھاتا، تب وہ بھاگ کر اندر سے اپنی ننھی سی دوربین اٹھا لاتا اور باقاعدہ مشاہدہ کرتا۔ مجھے بھی اس کی ذہین بھول پن کو نہارنے کے علاوہ اور کسی کام میں لطف نہ آتا۔ اس کے ایسے ہی بھول پن اور محویت کا فائدہ اٹھا کر میں اسے کھلا پلا دیتی، ورنہ فطرت کے اس پرستار کو میں باہر سے اندر لانا اگر بھول جاتی تو وہ کہیں باہر ہی سو جاتا، چاند کو سوچتا ہوا۔ تاروں کو دیکھتا ہوا۔ اور صبح جب اسے شبنم جگاتی تو شاید وہ پھر کسی ہدہد کو مٹی کی ننھی ننھی ڈھیریوں میں سے چھوٹے چھوٹے کیڑے ڈھونڈتے ہوئے دیکھنے میں کھو جاتا۔

میرے شوہر کہیں شہر سے باہر جاتے تو فون پر اسی کی باتیں کرتے مجھ سے۔ ہماری زندگی کا حصّہ بن گیا تھا وہ۔ ذہین بے انتہا تھا وہ، یادداشت غضب کی۔ موسیقی کا دلدادہ ایسا کہ کسی دن ڈھول میں اٹا ستار کا غلاف اتار کر میں اسے بجانے لگتی تو دیکھتی کہ وہ بغیر تھکے تقریباً پون گھنٹہ اپنے ہی انداز میں اپنا ایجاد کیا ہوا کوئی رقص کرتا رہتا۔ اس کے ننھے منے ہاتھ پیر نہ تھکتے۔ کبھی ایک ٹانگ آگے کو جا رہی ہے کبھی پیچھے کو۔ کبھی سامنے کے تکیے پر ایک آدھ لات رسید کی جا رہی ہے، کبھی ایک ٹانگ سے یا کبھی دونوں ٹانگوں سے

کُود اجا رہا ہے۔ دونوں ہاتھ ہوا میں لہرائے جا رہے ہیں۔ سر بائیں کو مڑتا پھر تھوڑی دیر بعد دائیں کو۔ اور اس طرح کی ہر حرکت میں میں دیکھتی کہ ایک رِدھم ہوتا۔ وہ جھوم جھوم جاتا۔ پسینہ پسینہ ہو جاتا۔ میں دیکھ دیکھ کر ہنستی۔ پھر ستار چھوڑ کر اسے گود میں بھر لیتی۔ وہ حیرت سے دیکھتا کہ آخر ایسا کیوں، پھر اور بجانے کی ضد کرتا۔ میں بہلانے لگتی:

''ذرا آنکھیں بند کرو!'' وہ آنکھیں میچ لیتا۔

''یہ لمبی پلکیں کہاں سے لائے؟''

''باجار سے'' وہ بھول پن سے جواب دیتا۔

''کتنے میں؟''

''دو لوپے میں''وہ آنکھیں پھیلا کر ابرو اٹھا کر دو پر زور دے کر کہتا۔ یہ بھولی بھالی باتیں مجھے زندگی کا احساس دلائے رکھتیں۔ اس کی آمد سے میرا ذہنی تناؤ دور ہو گیا تھا۔

اللہ نے میری بھی گود بھر دی۔

وہ کچھ بڑا ہوا تو اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ اب وہ صرف Week-End پر آتا۔ پھر کوئی سال بھر بعد ہمارا ٹرانسفر ہو گیا۔ ہم وہاں سے چلے آئے۔

اس کی جدائی کا غم پتھر کی سل کی طرح سینے پر رکھا تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے پہلوٹھی کے بیٹے کی طرح چاہا اور اس سے الگ ہو کر اس کے لیے ایسے ہی تڑپی جیسے ماں بچّے سے بچھڑ کر تڑپتی ہے۔ اُسی نے تو اپنے بچپن کو پہلے پہل میری گود میں جگہ دی تھی۔ مجھے ممتا اور محبّت سے آشنا کرایا تھا۔ وہ بھی ہم دونوں کو برابر یاد کرتا۔ ہم سے ملنے کو مچلتا۔ فون ہی کچھ تسلی تھا دل کو۔ کافی دیر بات چیت چلتی۔ میں فون پر کہتی کہ ذرا آنکھیں بند کرو۔ وہ فوراً آنکھیں بند کرتا میں پوچھتی کہ یہ پلکیں کہاں سے لائے تو ویسی ہی سنجیدگی سے کہتا کہ باجار سے، دو لوپے میں۔ اس کے چھوٹے سے دماغ میں یہ خیال نہ آتا کہ میں تو اس کی بند پلکوں کو دیکھ ہی نہیں سکتی۔ اُس کی امی مجھے بتایا کرتیں۔

پھر ایسے ہی دو تین سال گزر گئے۔ کبھی فون Connect ہوتا، کبھی کئی دن گزر جاتے۔ میرے دل سے اس کی محبّت ذرا کم نہ ہوئی۔ اس کی یاد میں میری آنکھیں بھر آتیں، چھلک جاتیں۔ دل اُسے ایک نظر دیکھنے کو تڑپ اٹھتا۔ باہیں اسے سینے سے لگانے کو مچلتیں۔ روح جدائی کے غم سے درد کرتی اور میں دل پر پتھر رکھ لیتی۔ اپنے بچوّں میں صبر ڈھونڈ لیتی، کہ صبر کرنا میں نے اسے پا کر ہی سیکھا تھا۔

ایک عرصے سے ہم بھی اور وہ لوگ بھی ملنے کا پروگرام بنا رہے تھے اور ملاقات تھی کہ طے ہی نہ ہو پاتی تھی۔ کچھ یہاں کا موسم کچھ وہاں کے حالات۔ اب کے سردیاں شروع ہوئیں تو وہ لوگ سچ مچ آ گئے۔ مجھے تو انھیں دیکھ کر بھی ان کی آمد کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا قد کچھ لمبا ہو گیا تھا۔ تتلاہٹ ختم ہو گئی تھی۔ پہلے سے کچھ کم گو ہو گیا تھا مگر دیکھنے میں ویسا ہی پیارا، دل موہ لینے والی صورت، کالی کالی بھولی سی آنکھیں، لمبی پلکیں، سیب ایسے گال اور سرخ سرخ کان، ہاتھ پاؤں وہی گورے، مکھن کے پیڑوں جیسے، مجھ سے لپٹا تو میں رونے ہی لگ پڑی اور وہ کتنی ہی دیر ہنستا رہا۔ میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے مسکرا کر کہا:

''ذرا آنکھیں بند کرو!'' اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ میں نے پوچھا :

''یہ پلکیں کہاں سے لائے؟'' تو شرما کر مسکرا دیا۔

میرے گھر میں بہاریں آ گئی تھیں۔ گھر میں کھانا اسی کی پسند کا بنتا۔ میں اسے طویل Drive پر لے جاتی۔ میرا سارا وقت اس کا ہو گیا تھا۔ مجھے میری گم گشتہ جنت مل گئی تھی۔

ایک دن صبح صبح گولیاں چلنے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ بھاگی بھاگی باہر نکلی تو دیکھتی ہوں کہ وہ بالکنی میں کھڑا منہ سے مختلف قسم کی گولیاں چلنے کی آوازیں نکال رہا تھا۔ ایسی مہارت سے کہ ان کے نقلی ہونے کا شک تک نہ گزرے۔

یہ سارا قصور میرا ہی تھا۔ وہ کتنے دن سے آیا تھا اور میں اس کے لیے ایک بھی کھلونا نہیں لائی تھی۔ اسی دن شام کو میں اس کی پسند کے کھلونے خرید لائی۔ جب وہ سو گیا تو میں نے وہ سارے کھلونے اس کی مسہری پر سجا دیے کہ صبح جاگتے ہی دیکھے گا تو کتنا خوش ہو گا۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ میں ذرا دیر سے جاگی۔ دیکھا کہ سارے کھلونے ایک طرف کو ایک ڈھیر کی شکل میں رکھے ہوئے ہیں اور وہ غائب۔ میں نے اس کی ماں سے پوچھا تو بولیں کہ سب بچّے بڑے کمرے میں کھیل رہے ہیں۔

بڑے کمرے کے دروازے پر اس کی مُنّی سی بہن ہونٹوں پر انگلی رکھے پہرا دے رہی تھی۔

''ششش! ادھر نہیں جانا۔ فائرنگ ہو رہی ہے۔'' وہ مجھے خبردار کرتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

اندر جھانکا تو عجیب منظر دیکھا۔ سارے گھر کے تکیے اور سرہانے ایک کے اوپر ایک اس طرح رکھے ہوئے تھے جیسے ریت کی تھیلیاں رکھ کر مورچے بنائے جاتے ہیں۔ وہ درمیان میں اوندھا لیٹا ہوا ایک بڑی سی لکڑی کو بندوق کی طرح پکڑے منہ سے مختلف طرح کی گولیوں کی آوازیں نکال رہا ہے اور اس کے دائیں بائیں میرے دونوں بچّے اپنی چھوٹی چھوٹی پلاسٹک کی بندوقیں لیے اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ جیسے حکم کرتا وہ دونوں ویسا ہی کرتے۔ کبھی ایک بھاگ کر ایک کونے میں گھستا، کبھی دوسرا دوسرے کونے میں یہ ہی عمل دہراتا۔ کبھی ایک بُک رَیک کی آڑ میں ہو کر دوسری طرف کودتا، کبھی دوسرا الماری کے پیچھے چھپ کر، جست لگا کر دیوار کے ساتھ چپک جاتا۔ اور وہ خود مورچہ سنبھالے کبھی ان کو ہدایت کرتا اور کبھی ان پر بندوق تان دیتا۔

اب یہ ہی اس کا پسندیدہ کھیل تھا۔ وہ میٹھی بولیاں، وہ رقص، وہ موسیقی...... وہ بھول گیا تھا اور یہ سب یاد دلانے کے لیے میں شاید اسے کہیں نہیں لے جا سکتی تھی۔

ایمان قیصرانی

# غزل

ایک ادھورے خواب کا منظر آنکھوں میں تحریر ہوا ہے
راتوں کا وہ چاند بنا ہے ، صبحوں کی تعبیر ہوا ہے

کیا کیا منظر دکھلائے ہیں، وقت کے رستے زخموں نے
دکھ کا گہرا سناٹا اب آنکھوں میں تحریر ہوا ہے

آنکھ کی رتھ پر بیٹھا سپنا ، اس کا نام ہی جپتا ہے
جس غزنی کے ہاتھ سے میرا دل مندر تسخیر ہوا ہے

آج بھی میرے سر کی چادر، تیرے عشق کا حجرہ ہے
آج بھی تیرا نقشِ کفِ پا، قدموں کی زنجیر ہوا ہے

ایماں ایک زمیں زادے کے عشق کا ہے اعجاز فقط
یہ جو ایک سخن دیوی سے شعر نگر تعمیر ہوا ہے

تنویر قاضی

## غزل

گُھگُھو گھوڑا کسی گُلیلی کا
کب تک رکھتا بھید پہیلی کا

خُوشبُو کا ادراک سنبھالتی یاد
رینگتا چھیلا سانپ چنبیلی کا

دل محراب کے کہاں گئے مہمان
بولتا جائے کاگ حویلی کا

آبِ سادہ میں گُھلتی اک پور
ذائقہ دیتی گڑ کی بھیلی کا

دیکھتی جائے ٹُکر ٹُکر ممٹی
بارش زدہ لباس سہیلی کا

آخرِ شب تک کرتا ہے بسرام
خواب آنکھوں پر اُس کی ہتھیلی کا

سُرخ سواگت میں اُترے عُشاق
پاؤں چُھو کر رُت البیلی کا

دلاور علی آزر

# غزل

زمیں سے پھول فلک سے ستارہ غائب ہے
نمو پذیر ہیں نظریں نظارہ غائب ہے

بنا رہا ہے خدا جانے کوزہ گر کیا چیز
گھما رہا ہے فقط چاک گارا غائب ہے

بھٹک رہے ہیں مسافر گھنے سمندر میں
چٹک رہے ہیں بدن اور کنارہ غائب ہے

ہمیں ملا نہیں ناظر کوئی ٹھکانے کا
ہمیں کہا گیا حاضر تمھارا غائب ہے

ہمارے اشک کہیں رایگاں نہ ہو گئے ہوں
کتابِ غم سے حوالا ہمارا غائب ہے

کہیں کہیں کوئی موجودگی ہے منظر میں
کبھی کبھی تو یہ لگتا ہے سارا غائب ہے

سخن میں گُم ہیں زمانے کی ساری تشبیہات
علامتوں میں کہیں استعارہ غائب ہے

دلوں پہ اُس کا اثر ہو بھی کس طرح آزر
وہ شعر جس سے محبت کی دھارا غائب ہے

راؤشہباز

# غزل

ایک پہاڑن، بھوری آنکھیں، کان میں نیلی بالی تھی
اور پھر اک کیلاش کی دیوی، جس کی چنری کالی تھی

اک جوگی ہر شام، نگر میں ایک آواز لگاتا تھا
اللہ بخشے ٹھکرائن، جو آٹا دینے والی تھی

دو جھیلوں کا آب لگائے اپنے سندر ماتھے پر
مندر کا ناقوس بجاتی وہ لڑکی بھوپالی تھی

عشق کے راج سنگھاسن پر یہ دو کردار اچھوتے ہیں
اک نے تخت ہزارہ چھوڑا، اک نے نہر نکالی تھی

شام سمے خاموش ندی کی جس سندور نے مانگ بھری
وہ مغرب کی کوکھ میں گرتے اک سورج کی لالی تھی

جس دن گھر میں آگ لگی اور سب کچھ جل کر راکھ ہوا
اس دن گھر میں دو بہنوں کی شادی ہونے والی تھی

جس کے آگے ساحر کے سب جنتر منتر ہیچ گئے
حُسن کے بان سے گھائل کرتی وِش کنیا روپالی تھی

سدرہ سحر عمران

# غزل

جتنا بانٹا تو نے خود کو جتنا چھوڑا ، رکھا ہے
بات ہمارے حصے کی ہے اس کو تھوڑا رکھا ہے

جب چاہا آوازیں پہنیں اور جب چاہا خاموشی
ہونٹوں کی الماری میں ہر رنگ کا جوڑا رکھا ہے

اب بھی کھانے کی ٹیبل پر اوندھی ہیں ساری چیزیں
چار پلیٹیں کانچ کا جگ جو کچھ بھی توڑا ، رکھا ہے

میرے بچپن کی گڑیا مجھ میں تحلیل ہوئی لیکن
اک شہزادہ اور اک بے کاٹھی کا گھوڑا رکھا ہے

جسم گلابی کاغذ جس کو غم کی دیمک چاٹ گئی
تیرے نام کی مہر تھی اس پر توڑا موڑا رکھا ہے

ساری رات ہی میری آنکھیں ایسے دکھتی رہتی ہیں
جیسے ان میں خواب نہیں بلکہ اک پھوڑا رکھا ہے

شاہدہ جہاں گیر

## غزل

پرندہ جس نے پروں میں مجھے سلایا تھا
اڑان بھر گیا کس جا؟ کہاں سے آیا تھا

برس رہا تھا کوئی نور سا مرے ہر سو
ستارہ اڑ کے کوئی میری گود آیا تھا

دعائیں کرتی تھیں شاخیں چنار روتے تھے
وہ اب کے لہجے میں کچھ برف ساتھ لایا تھا

اٹھا غبار زمیں سے، فضا ہوئی گدلی
فلک پہ ابر بھی بے مہریوں کا چھایا تھا

سلگتا رہتا ہے دل اس کو یاد کر کر کے
وہ جس نے ہم کو نومبر میں تمتمایا تھا

اسی نے ابر نئے جبر کے مجھے بخشے
بہار سا جو مرے آسماں پہ چھایا تھا

ستارے رقص میں مصروف سے رہے اس شب
وہ چاند زینۂ دل پر سرکتا آیا تھا

Özdemir Asaf

مترجم: فرحت آریز

# Hoşçakal

## خدا حافظ

میں اپنے پیانو کے سیاہ و سفید کلیدوں پر
تمھیں بجا رہا ہوں ابھی
اور جوں جوں بجا رہا ہوں،
تم پھیلتی جا رہی ہو کمرے میں
اور جوں جوں تم بڑھتی جاتی ہو؛
میں غائب ہوتا جا رہا ہوں

میں تمہیں راتوں میں جنم دیتا ہوں،
چاند کو دیکھتے ہوئے میں تمہیں تمہارا نام دیتا ہوں
ہر شے تمہارے وجود میں تبدیل ہو جاتی ہے؛ ہر جگہ تم ہوتی ہو
میں مر جاتا ہوں

اپنے خوابوں میں تمہاری آواز سنتا ہوں،
تمہارا نور مجھے خیرہ کر دیتا ہے
اور ہوا مجھے تمہاری طرح چھوا کرتی ہے
میں پیدا ہوتا ہوں

مجھے مت بتاؤ تم کہ میں کیا سننا چاہتا ہوں
تم مجھے مت چھوؤ۔۔
ایک بجلی تمہاری طرح کڑکتی ہے۔۔
بجلی کی کڑک سیدھا میرے دل پر گرتی ہے۔۔
اور میں چلا جاتا ہوں۔

Özdemir Asaf
مترجم: فرحت آریز

# Ben değildim
# یہ میں نہیں تھا

ایک شامگاہ تم اپنی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی
آہستہ آہستہ رہ رواں تاریکی کو
میرے جیسا کوئی شخص تمہارے گھر کے سامنے سے گزرا تھا
تمھارا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا
وہ گزرنے والا میں تو نہیں تھا

ایک رات، تم اپنے بستر پر سو رہی تھی
تم اچانک سے اٹھی، عالمِ سکوت میں
ایک خوابچہ تھا جس نے تمہاری نیند اڑا دی تھی
اور تمہارا کمرا اندھیرے سے بھرا ہوا تھا
وہ میں تو نہیں تھا جس کو تم نے دیکھا تھا

تب جب میں بہت دور تھا،
بے سبب ہی تمہاری آنکھوں سے آنسوں ریزاں تھے
کیوں کہ تم مجھے سوچنے لگی تھی
تم نے خود کو خیالِ عشق میں چھوڑ دیا تھا
وہ میں نہیں تھا جو یہ سب جانتا تھا

تم اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی، کوئی کتاب پڑھ رہی تھی
جہاں لوگ یا تو محبت میں مبتلا ہو رہے تھے یا مر رہے تھے
کسی نوجواں کو قتل کر دیا گیا تھا اس کتاب میں
تم ڈر گئی تھی، تم بہت رونے لگ گئی تھی
وہ میں تو نہیں تھا جو مر گیا تھا

Guy De Maupassant
مترجم: ایم حسن عازم

# In the Moonlight
# چاندنی میں

ابیے مار گنن کی نیک روح ''خدا کے سپاہی'' کے نام سے منسوب تھی۔ وہ ایک قد آور، نحیف الجثہ پادری، عقائد میں متعصب مگر ایک بلند مرتبہ روح تھی۔ وہ اپنے تمام تر عقائد میں اتنا پختہ تھا کہ متزلزل ہونے کی ذرہ برابر گنجائش نہ تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ خدا کی ذات میں اِس قدر مستغرق ہے کہ اُس کے نقوش، اُس کی خواہشات اور اُس کی ترجیحات کا حصہ بن چکا ہے۔

قصبے میں اپنے گھر کے باغ کی سیر میں لمبی لمبی فرلانگیں بھرتے ہوئے کبھی کبھی اس کے ذہن میں ایک سوال اُبھرتا کہ ''خدا نے یہ سب کیوں بنایا؟'' پھر تصور میں خود کو خدا کی جگہ پر رکھتے ہوئے بضد ہو جاتا اور خود کو مطمئن کر لیتا کہ اُسے وجہ مل گئی ہے۔ وہ عجز و انکساری میں بخل کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ ''اے خدا، تمہاری راہیں ماضی کو سمجھنے میں معاون ہیں!'' جو کچھ اُس نے کہا وہ یہ تھا: ''میں خدا کا خادم ہوں؛ میں متجسس ہوں کہ وہ کیا کرتا یا کیا الہامی ہوتا اگر میں نہ ہوتا۔''

اُس کے نزدیک فطرت کی ہر چیز کو خالص اور قابلِ فہم بنایا گیا تھا۔ کیسے اور کیوں جیسے سوالوں کو متوازن سطح پر رکھا گیا تھا۔ صبح سحر گاہی کو جاگتے ہی خوش ہونے کے لیے بنایا گیا، دنوں کو پکی ہوئی فصلیں کاٹنے کے لیے، بارشیں اِن فصلوں کو پانی دینے کے لیے، شام سونے کی تیاری کرنے کے لیے اور ظلمتِ شب سونے کے لیے بنائی گئی تھی۔

چار موسم زراعت کی ضروریات کے عین مطابق بنائے گئے اور اُس کے نزدیک شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ عالمِ رنگ و بو بغیر قصد کے ہے اور اس کی تمام تر موجودات خود بہ خود وجود کے پیکر میں ڈھل گئیں۔ اِس کے برعکس، مختلف ادوار کے سخت ترین حالات، موسمی تغیرات اور مادہ کے ماسوا۔

مگر اُسے عورتوں سے نفرت تھی؛ وہ اُن سے غیر شعوری طور پر نفرت کرتا اور فطرتاً ہی انھیں برا سمجھتا تھا۔ وہ ہمیشہ یسوع مسیح کے یہ الفاظ دہراتا: ''عورت، مجھے تم سے کیا لینا دینا ہے؟'' اور پھر وہ اضافہ کرتا: ''ایسا کہا جا سکتا ہے کہ خدا خود بھی اپنے ہاتھوں کی اِس کاری گری سے ناخوش تھا۔'' عورت اُس کے نزدیک ''بارہ گنا نہ پاک بچے'' کی مانند تھی جس کے بارے میں شاعر کہتا ہے۔ وہ دامِ محبت میں پھنسانے والی ہے جس نے پہلے آدمی کو جرم کا مرتکب کر دیا اور جس نے اب بھی اپنے ملامت انگیز کام جاری رکھے

ہوئے ہیں۔ وہ کمزور، خطرناک اا بے حد پُر آشوب مخلوق تھی۔ اور اس کی زہر جیسی خوبصورتی سے کہیں زیادہ وہ اس کی محبت کرنے والی روح سے نفرت کرتا تھا۔

اُس نے ہمیشہ عورت کی نزاکت کو خود پر حملہ آور محسوس کیا تھا، اور اگرچہ ب

پھر بھی ہمیشہ دلوں میں لرزش پیدا کر دینے والی محبت خفا رہتا۔

اُس کا خیال تھا کہ کو مرد کی آزمائش اور اسے پرکھنے کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ آدمی کو اپنے دفاع کے لیے احتیاطی تدابیر کیے بغیر عورت تک رسائی حاصل نہیں کرنی چاہیے اور وہ خوف جو وہ اپنے اندر پالتا ہے، گھات لگا کر حملہ کرنے کے لیے۔ در حقیقت عورت مرد کی طرف اپنے کھلے بازوؤں اور نیم والبوں کے ساتھ ایک جال ہے۔

وہ بس راہبہ خواتین کو ہی برداشت کرتا، جو کہ اپنے اقرار کی وجہ سے بالکل بے ضرور تھیں؛ اِس کے باوجود وہ اُن سے بڑی سختی سے پیش آتا، کیوں کہ، ہمیشہ اُن کے بے آرزو قلوب، اُن کے تذکیہ شدہ قلوب، کے لیے وہ ایک دائمی ملائمت محسوس کرتا جو مسلسل ابھر کر اس کے سامنے آتی حالاں کہ وہ ایک پادری تھا۔

اُس کی ایک بھانجی تھی جو اپنی ماں کے ساتھ پاس ہی میں رہتی تھی۔ وہ اُسے خیراتی ادارے کی راہبہ بنانے کا آرزومند تھا۔ وہ پیاری تھی اور عاقبت نااندیش اور بہت زیادہ زچ کرنے والی۔ جب ایسے نصیحت کرتا وہ ہنس دیتی؛ جب وہ اُس پر غصہ کرتا تو وہ اسے شدت سے چوم لیتی، اُسے جھنجھوڑتے ہوئے جب کہ وہ غیر ارادی طور پر خود کو اس کی بانہوں سے آزاد کروانے کی راہ ڈھونڈتا۔ تاہم، یہ احساس اُسے ایک ہلکا سا لطف مہیا کرتا، اُس کے اندر عمیق گہرائیوں میں جاگتا ہوا ایک باپ جو کہ ہر مرد کے اندر کہیں نہ کہیں اونگھ رہا ہوتا ہے۔

وہ اکثر کھیتوں کے درمیان سے راہگیروں کے لیے بنائی گئی پٹڑی پر اُس کے ساتھ چلتا ہوا اُس سے خدا کی باتیں کرتا، اپنے خدا کی۔ وہ بہ مشکل ہی متوجہ ہوتی مگر وہ اپنی آنکھوں میں زندگی کی رمق لیے ہوئے مسرت بھری نگاہوں سے آسمان، گھاس اور پھولوں کو دیکھتی۔ بعض اوقات کسی اڑتی ہوئی مخلوق کو پکڑنے کے لیے آگے کو دوڑتی اور پھر چلاتے ہوئے اسے واپس لاتی۔ ''دیکھیے، ماموں جان، یہ کتنی خوبصورت ہے؛ دل چاہتا ہے کہ میں اِسے چوم لوں۔'' اور جگنوؤں کو یا خوبصورت پھولوں کو یوں چومنا پادری کو پریشان، مشتعل اور منحرف کر دیتا جو کہ دیکھتا، حتّٰی کہ یہاں پر بھی، عورتوں کے دل میں پھوٹتی ہوئی ناقابلِ استحصال نزاکت۔

ایک دن سیکر سٹانز کی بیوی، جو کہ ایبے مارگنن کے گھر کی دیکھ بھال کرتی تھی، بڑے محتاط انداز میں اُسے بتایا کہ اُس کی بھانجی کا کسی کے ساتھ معاشقہ ہے!

اُس نے خود کو آزاردہ جذبات میں ڈوبتا ہوا محسوس کیا اور شیو بناتے ہوئے چہرے پر صابن کے ساتھ حواس باختہ اٹھا۔

جب اُس نے خود کو ہوش میں محسوس کہ وہ بول اور سمجھ سکتا ہے تو ایک مرتبہ پھر چلایا: ''یہ سچ

نہیں ہے؛ تم جھوٹ بکتی ہوئی میلنی!""

مگر اُس کسان عورت نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا "ہمارا خدا میری سخت پکڑ کرے اگر میں جھوٹ بول رہی ہوں، جناب پادری۔ میں آپ کو بتاتی ہوں وہ ہر روز شام جب آپ کی بہن سو جاتی ہے اُس سے ملنے جاتی ہے۔ وہ دونوں دریا کے پیچھے ملتے ہیں۔ آپ دس سے آدھی رات کے درمیان وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے گا۔""

اُس نے اپنی ٹھوڑی کو کھر چنا بند کیا اور جلدی سے کمرے کی بہ جانب رواں دواں ہوا۔ جیسا کہ وہ ہمیشہ اپنے مغموم ترین خیالات میں ڈوبے ہوئے گھنٹوں میں کرتا۔ جب اُس نے دوبارہ اپنی داڑھی بنانا شروع کی، تین مرتبہ اُس نے ناک سے کان تک خود کو زخمی کر لیا۔ وہ سارا دن خاموش رہا، طیش اور غصے سے بھرا ہوا۔ محبت کے بر خلاف اُس کے روحانی جوش کے ساتھ ساتھ اب ایک باپ، ایک استاد، ایک روحانی پیشوا کی اخلاقی خفگی بھی شامل ہو گئی تھی، جسے دھوکا دیا گیا تھا، چوری کی گئی تھی اور جس کے جذبات کے ساتھ ایک بچے نے کھیلا تھا۔ اس نے مغرورانہ دکھ محسوس کیا جیسا کہ والدین کرتے ہیں جب اُن کی بیٹی انھیں بتائے کہ اُس نے اُن کے اور اُن کے مشورے کے بغیر شوہر کا انتخاب کر لیا ہے۔

رات کے کھانے کے بعد اس نے پڑھنے کی کوشش کی مگر وہ خود کو مرکوز نہ رکھ سکا؛ اور مزید غصے اور مزید غصے سے بھرتا گیا۔ جب دس بجے، اُس نے اپنی لاٹھی اٹھائی؛ ایک خوفناک اوک کا بنا ہوا ڈنڈا، جسے وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتا جب کبھی اسے رات کے وقت کسی مریض کی تیمارداری کرنے کے لیے جانا پڑتا۔ ایک دیہاتی کی طرح چہرے پر مسکراہٹ سجائے پختگی سے مٹھی میں ایک دیو ہیکل ڈنڈا پکڑے اور اس سے ہوا میں تہدیدی دائرہ بناتے ہوئے۔ پھر اچانک اُس نے ڈنڈے کو اٹھایا اور اپنے دانتوں کو پیستے ہوئے اسے کرسی پر نیچے لے آیا۔ جس کا پچھلا حصہ دو ٹکڑوں میں ٹوٹ کر دھڑم سے نیچے آن پڑا۔

اُس نے باہر جانے کے لیے اپنا دروازہ کھولا؛ مگر وہ دہلیز پر رُک گیا. درخشاں چاندنی کو دیکھ کر حیران جو کبھی کبھار ہی نظر آتی ہے۔

اُس نے خود کو ایک ممتاز جذبے کے سپرد کیا ہوا تھا، ایسا جذبہ جو تخیل میں مستغرق شاعروں کا ہوتا ہے، چرچ میں موجود راہبوں کا ہوتا ہے، اچانک اُس نے اپنی طبیعت میں نرمی محسوس کی، جسے زرد چہرے پر موقوف رات نے بدل دیا تھا۔

اُس کا چھوٹا سا باغیچہ آنکھوں کو چوندھیا دینے والی روشنی سے نہایا ہوا تھا، اُس کے پھلوں کے درختوں کی قطاریں عکس میں چند قدموں تک واضح ہو رہی تھیں جن میں سے چند ایک درختوں کی لمبی ٹہنیاں سبزے سے مرصع تھیں؛ جب کہ ایک بڑا ہنی سکل دیوار پر چڑھتا ہوا، مزیدار اور مٹھاس سے بھری ہوئی سانسیں چھوڑ رہا تھا جو کہ گرم اور صاف رات میں نکہت بھری روح کی طرح گھوم رہی تھیں۔

وہ لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگا، ہوا کو پینے لگا جیسے شرابی شراب کو پیتے ہیں اور آہستہ آہستہ، بالجبر اور حیرانی میں مبتلا چلنے لگا اور اپنی پانجھی کو تقریباً بھول چکا تھا۔

جیسے ہی وہ کھلے میدان میں پہنچا ساری ہموار زمین کو دیکھنے کے لیے رُک گیا، باز بردار چمک کے سیلاب میں گھیرا ہوا اور اُس پر سکون رات کی محبت بھری، نازنیں کشش میں ڈوبتا ہوا۔ ہوا میں مینڈکوں کے سنگیت، سر، موہ لینے والی چاندنی کے ہمراہ بکھرے ہوئے تھے جس میں فاصلے پر موجود بلبلوں کی چنچل سی موسیقی ملی ہوئی تھی جو خیالات کو نہیں بلکہ خوابوں کو ابھار رہی تھی، ایک ہلکی سی اور اتار چڑھاؤ سے مرصع موسیقی جو ایسے لگتا کہ جیسے بوسہ لینے کے لیے ہی ترتیب دی گئی ہے۔

ایبے نے چلنا شروع کیا، اب اس کا حوصلہ ٹوٹ رہا تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کیوں۔ اب وہ خود کو کمزور محسوس کرنے لگا اور اچانک سے تھکا ہوا۔ وہ شدت سے چاہتا تھا کہ بیٹھ جائے، وہیں پر وقفہ لے اور خدا کی کاریگری پر اس کی تعریف بجا لائے۔

اُس کے نیچے، چھوٹے سے دریا کے خم آور کنارے کے ساتھ ساتھ پاپولر کے درختوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ دریا کے دونوں کناروں پر، پیچیدہ آبی راستے کو روشنی نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، شفاف لہریں جن پر گہری دھند معلق ہے، سفید رنگ کے بخارات جنہیں چیرتے ہوئے چاند کی روشنی چاندی جیسا رنگ دے رہی ہے اور ان کے چمکنے کا سبب بن رہی ہے۔

پادری دوبارہ رُک گیا، بڑھتے ہوئے اور شدت پکڑتے ہوئے جذبات کی وجہ سے اپنی روح میں اترتا ہوا۔ اور ایک تشکیک، ایک مبہم سی بے چینی، اُس پر مغصوب ہو رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ سوالات جو کبھی کبھار وہ خود سے کرتا تھا اب دوبارہ جنم لے رہے تھے۔

خدا نے ایسا کیوں کیا؟ حتّٰی کے رات تو نیند سے منسوب ہے، بے خبری کے لیے، آرام کے لیے، ہر چیز کو بھول جانے کے لیے، پھر کیوں! اِسے دن سے زیادہ پُرکشش بنایا، صبح اور شام کی شفق سے زیادہ میٹھا۔ اور یہ سست رفتار، مائل کرنے والے ستارے، سورج سے زیادہ شاعرانہ اور اتنے نفیس کہ لگتا ہے جیسے چیزوں کو بہت نفاست سے روشن کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں، ڈھیر ساری روشنی سے کہیں زیادہ تجسس آمیز۔ یہ تمام تر رنگوں کو اُجلا کرنے کے لیے کیوں آتے ہیں؟ اور یہ شیریں گیت گانے والی چڑیاں رات کو دوسروں کی طرح سوتی کیوں نہیں ہیں؟ یہ اعصاب پر ہلکی سی رقت طاری کر دینے والی رات میں یہ خود کو گانے کے لیے مختص کیوں کر دیتے ہیں؟ اِس عالم دنیا پر یہ آدھا حجاب کیوں؟ یہ دل کی دھڑکنیں، یہ روح کے جذبات، یہ بدن کی نقاہت کس لیے؟ اِس کشش کا نظارہ کس لیے جسے انسان دیکھ نہیں سکتا جب کہ نیند اسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے؟ یہ سب اِتنا بڑا تماشا کس کے لیے مطلوب تھا؟ اور سخن کا یہ سمندر جسے جنت سے زمین پر انڈیلا گیا؟ ایبے کو کسی چیز کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

لیکن اُسی وقت نیچے چراگاہ کے کنارے درختوں کے دھند سے چمکتی ہوئی چھتوں کے نیچے دو سائے نمودار ہوئے جو ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

یہ ایک قد آور آدمی تھا جس نے اپنے بازو کو اپنی بیوی کی گردن میں ڈالا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اُس کی جبیں سے بوسہ لے رہا تھا۔ انھوں نے ایک بے جان منظر کو متحرک کر دیا تھا جس نے انھیں گھیر رکھا تھا، ایک روحانی کینوس جیسے کہ وہ ہو ہی اُن کے لیے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہی ایک انسان ہے، یہی

جس کے لیے یہ پُر سکون اور خاموش رات بنائی گئی ہو؛ اور وہ پادری تک زندہ و جاوید جواب کی طرح پہنچ گئے، وہ جواب جو اُس کے خدا نے اُس کے سوال پر دیا ہو۔

وہ بالکل بے حس و حرکت، ہیجان زدہ اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کھڑا رہا۔ اُسے یہ کہانی انجیل کے کسی قصے کی طرح لگی، جیسے کہ روتھ اور بوز کی محبت، اُن عظیم مناظر میں سے ایک میں خدا کی مرضی کا پورا ہونا جیسا کہ پاک نَوِشتے میں رقم ہے۔ عظیم گیتوں کے ورسک اُس کے ذہن میں محوِر قص تھے، وہ پُر جوش شور، انسان کی آوازیں، اُن نظموں کی جذبۂ شوق سے سرشار شاعری جو محبت اور نزاکت سے مرقع ہوں۔ اور پھر وہ خود سے گویا ہوا۔ ''شاید خدا نے ایسی راتوں کو جیسی یہ ہے انسانوں کی محبت پر اپنے نظریات کو ملبوس کرنے کے لیے بنایا ہے۔''

اِس سے پہلے کہ وہ جوڑا جو بانہوں میں بانہیں ڈالے اُس طرف آرہا تھا وہاں پہنچتا وہ وہاں سے چلا گیا۔ یہ سچ میں اُس کی بھانجی ہی تھی؛ اور اب اس نے خود سے پوچھا اگرچہ اس نے خدا کی خلاف ورزی کی کبھی کوشش بھی نہیں کی۔ کیا خدا سچ میں محبت کی اجازت نہیں دیتا، حتیٰ کہ اُس نے ہر طرف اس خوبصورتی کو دکھا رکھا ہے؟

اور وہ وہاں سے فرار ہو گیا، حیرانی میں تقریباً جھجھکتا ہوا جیسے کہ وہ چرچ میں داخل ہوا تھا جہاں اسے داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔